اوراق

قواعد رسالہ "نگار"

۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

۳ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیئے - جن پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردئے جاتے ہیں

۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئے

۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۳ روپیہ

تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۸ روپیہ	۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے اُن کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) ہیا اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

(دوسرا اڈیشن)

حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت ...... عه/

گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول ع

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے قیمت علاوہ محصول عه

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص با سانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت، بیماری، شہرت و گمنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہو قیمت علاوہ محصول عه

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں علاوہ محصول ۱۰/

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک نہایت دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں انکی ہی تشریح بھی کی ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے قیمت علاوہ محصول ۱۲/

صحابیات

جسمیں عہد رسالت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دئے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اہتمام سے لکھا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عه

تذکرۂ خندۂ گل

مولفہ عبدالباری آسی جسمیں ۳۰۰ سے زائد اردو و فارسی ظریف شعرا کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف کے انتخاب کلام کے درج ہیں قیمت علاوہ محصول عه

ضمیمۂ نگار

(آپ اس کی خانہ پری کر کے منیجر نگار کو بغیر ٹکٹ بھی بھیج سکتے ہیں)

منیجر صاحب نگار۔

(۱)۔ میں حسب ذیل خریدار نگار کو دیتا ہوں۔ جنوری ۳۲ء کا نگار (جو ۲۰۰ صفحات پر مطائبات غالب کے لئے وقف ہے) معہ جدید سہ رنگی تصویر غالب کے بذریعہ وی پی بھیجکر سالانہ چندہ معہ محصول پانچروپیہ چار آنہ وصول کر لیجئے۔

(۲) حسب ذیل کتابیں بھی اس رعائتی قیمت پر جو اُن کے نیچے درج ہیں ساتھ ہی بذریعہ وی پی بھیجدیجئے۔

ظریف شاعروں کا تذکرہ (اصل قیمت للعہ) رعائتی قیمت عہ

جذبات بھاشا مصنفۂ نیاز فتحپوری (اصل قیمت ۱۲) رعائتی قیمت ۶

شاعر کا انجام مصنفۂ نیاز فتحپوری (اصل قیمت ۱۰) رعائتی قیمت ۵

فراست الید مصنفۂ نیاز فتحپوری (اصل قیمت عہ) رعائتی قیمت ۸

فراست التحریر ہر دو حصے (اصل قیمت عہ) رعائتی قیمت ۸

محصول علاوہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جدید خریداروں کا نام و پتہ ذیل میں درج ہے۔

....

(الف)۔ ....

....

(ب)۔ ....

(نوٹ)۔ اگر رعائتی کتابیں نہیں لینا ہو (۲) کو قلمزد فرما دیجئے یا جو کتابیں لینا ہوں اُن کو باقی رکھ کر باقی کو کاٹ دیجئے۔

راقم ....

....

بسم اللہ

نگار

جلد ۲۰ فہرست مضامین نومبر ۳۱ء شمارہ ۵

مضمون	مصنف	صفحہ
ملاحظات	اڈیٹر	۲
کاروبار کی موجودہ سرد بازاری کے اسباب	محمد عاقل ام - اے	۹
موسم بہار کی ایک رات	طالب باغپتی	۲۱
عہد اسلام میں کنیزوں کا اثر و اقتدار	اڈیٹر	۳۸
"جب" کی ترقیاں "اب" کے مقابلہ میں	"	۴۵
عمر برق خرام	ترجمہ	۵۴
شبستان کا قطرۂ گوہریں	اڈیٹر	۶۵
باب الاستفسار	"	۶۹
عورت کی آزادی کی انتہا غلامی ہے	"	۷۴
جدید جرمنی کی رجعت عہد اسپارٹا کی طرف	"	۷۸
فضا کی مملکت میں (ترجمہ)	"	۸۱
درس عمل (نظم)	کوکب شاہجہاں پوری	۸۵
پرانی یادگاریں (نظم)	علی اختر (حیدر آباد دکن)	۸۶
تاروں بھری رات (نظم)	عدم	۸۸
انقلاب (نظم)	محمود اسرائیلی	۸۹
نوائے پریشاں (نظم)	حافظ غازی پوری	۹۰
معلومات	اڈیٹر	۹۲
بقیہ ملاحظات بسلسلۂ صفحہ ۸	"	۹۵

نگار

جلد ۲۰ نومبر ۱۹۳۱ء شمارہ ۵

ملاخطات

منم کہ بر دل و دین خود اعتمادم ہست
بہ نیم غمزہ ہم ایں رارہاے دہم آں را —————— (غالب)

انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی بھی آتی ہیں جب وہ محوِ خواب ہوتا ہے لیکن انسانیت آپ ہی آپ بیدار ہوتی رہتی ہے، اس کے قوا بظاہر بیکار نظر آتے ہیں لیکن روح اپنا کام کرتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے جوارح ظاہری درد و تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن قلب و دماغ آہستہ آہستہ "سکون جاں" کی منزل سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانیت پوری طرح آنکھ کھول کر مسکرانے لگتی ہے، روح ایک فاتحانہ مسرت کے ساتھ اچھل پڑتی ہے، قلب و دماغ نشۂ کامیابی و نشاط سے سرشار ہو جاتے ہیں اور —————— اور۔ پھر آخر کار خود انسان بھی چونک پڑتا ہے، اس کے اعضا بھی بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے جسے "آشتیِ جسم و روح" سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اسی کا دوسرا نام دنیائے عمل ہے، اسی کو عالم تگ و دو کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے شاعرانہ زبان میں "شک زمیاں رفت و یقیں جلوہ کرد" سے تعبیر کرنا چاہئے۔

ابتدائے آفرینش سے لیکر تا ایندم، کرۂ ارض کی زندگی پر کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی دن، کوئی ساعت، بلکہ میں تو کہوں گا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہے، جس میں قدرت کے اس نظامِ فطرت کے اس اصول اور خدا کی اس نہ تبدیل ہونے والی سنت پر کشود کار کا انحصار نہ رہا ہو جواہر فرد اور قوت کا باہمی تعلق، مادہ کی مختلف صورتیں: ایتھر بلکہ ماورا، ایتھر میں عناصرِ آفرینش کا نواۃ اور برقپاروں کی صورت اختیار کرنا، لطخات سحابیہ کا رفتہ رفتہ منجمد ہو کر مختلف کُروں، سیاروں، چھوٹے بڑے ستاروں، چاندوں، اور شہاب ثاقب میں تبدیل ہو جانا - یہ کیا ہے - کیا یہ سب اسی بیداری کا نتیجہ نہیں، کیا مادہ کا تفاعل اس کی بیداری نہیں ہے کیا برقپاروں کی گردش ان کا نشاطِ عمل نہیں، کیا آفتاب کے طلوع و غروب، چاند کے ایاب و ذہاب میں اس ابتسامِ خداوندی کی جھلک موجود نہیں جس کے پرتو سے تمام ملکوتی قوتیں دفعۃً جگمگا اٹھتی ہیں

ابراہیم کی بت شکنی کیا اسی بیداری کا نتیجہ نہ تھی، موسیٰ کا فرعون کی قوت قہرمانی کے مقابل میں آجانا کیا روح وجسم کے اتحاد کا نتیجہ نہ تھا، عیسیٰ کا صلیب پر چڑھ جانا کیا اس احساس کے علاوہ کچھ اور تھا، مہاتما بودھ کا شاہانہ جاہ و جلال کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دینا کیا کسی اور قوت کا کرشمہ تھا، رام چندر جی کی صحرا نوردیاں کیا کسی جذبۂ غیر روحانی سے متعلق تھیں، کرشن جی کی معرکہ آرائیاں کیا کوئی اور منظر پیش کرنے والی تھیں، کنفوشیوس کی ذات کیا کسی غیر صادق کیفیت کا مظہر تھی، زرتشت کی زندگی میں کیا کسی اور شعلہ کی جھلک پائی جاتی تھی، سرزمین عرب سے پیدا ہونے والے سب سے بڑے انسان کا کوہ فاران پر چڑھ کر کفار عرب کو پیامِ خداوندی پہونچانا کیا کسی اور احساس کا نتیجہ تھا، حسینؑ کی عظیم الشان قربانی کیا کوئی اور روداد عمل تھی، منصور کے ساتھ دار و رسن کا معاملہ بھی اسی معمہ کی گرہ کشائی تھی اور منصور کے حلقوم پر تیغ کی روانی بھی اسی حقیقت کا اعادہ تھا

لیکن جس طرح قدرت صدیوں تک محوِ خواب رکھنے کے بعد نوعِ انسانی کو بیدار کرنے کے لئے اس کے کسی ایک فرد کا انتخاب کرلیتی ہے، اسی طرح وہ یہ بھی کرتی ہے کہ وہ قرنوں تک بیدار رکھنے کے بعد دوبارہ آہستہ آہستہ نیند طاری کر دیتی ہے۔ پھر تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کے لئے یہ نیند موت کی نیند میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے فنا ——— اور کبھی یہ نیند پھر ایسی بیداری اختیار کرلیتی ہے جیسے مردہ میں از سرِ نو جان پڑ جائے

کہا جاتا ہے کہ اصلاح کی بنیاد انسان کے جہل سے شروع ہوتی ہے اور علم کی روشنی میں اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چیز جہل کے دُور کرنے کے لئے آئے گی اس کی ابتداء عہدِ تاریک ہی سے ہوگی اور یقیناً جب علم کی ترقیاں انسانی دماغ کو منور کر چکیں گی تو دورِ اصلاح ختم ہو جائے گا اگر اس کا مقصود انسان کو کسی محدود منزل تک پہونچا کر ٹھہر جانا ہو، لیکن اگر کوئی خیال دنیا میں ایسا ہے یا ہو سکتا ہے، جس کے دائرۂ عمل سے تعین منزل کا سوال خارج ہے یا جس نے لانہایت کو اپنی تگ و دو کا جولانگاہ مقرر کیا ہے یا جس کا مدعا عقول انسانی کو ہر وقت اور ہمیشہ منور کرتے رہنا ہے یعنی اگر کوئی تعلیم ایسی ہے جو اخلاق ہی کی ترقی کو منتہائے نظر قرار دیتی ہے، جس کی دعوت عالمِ انسانی کے ہر ہر فرد کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر سکتی ہے اور

جو تمام ظاہر پرستیوں سے بلند ہو کر انقیاد فطرت کا مفہوم صرف روح کے جھک جانے کو ... قرار دیتی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ایسی تعلیم کو ختم ہو جاتا ہے

مَیں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک تعلیم اخلاق کا سوال ہے اس وقت تک جتنی اصلاحیں دنیا میں بروے کار آئیں ان سب کا مقصود ایک ہی تھا سب نے یہی تعلیم دی کہ اچھے کام اچھے اور برُے کام برُے ہیں، لیکن اس تعلیم کے عملی پہلو کے لحاظ سے جو اصول و قواعد انھوں نے مقرر کئے وہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ضرور مختلف تھے اور انھیں مختلف ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ انکا عقول انسانی کے مطابق ہونا ضروری تھا، اور عقول انسانی کی ترقی ہمیشہ سے جاری ہے اور رہے گی۔ لیکن جس وقت ہم تقابلاً ان کا مطالعہ کریں گے، اُن کے مقاصد تعلیم اور اُن کے اصول اصلاح اور ان کے اس پیغام پر غور کریں گے جو انھوں نے نوع انسانی تک پہونچایا تو ہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان تمام تعلیمات میں صرف ایک ہی تعلیم ایسی ہے جس کے نصب العین کی بلندی ازل سے لیکر ابد تک تمام کائنات کا احاطہ کر لینے والی ہے اور جس نے اگر ایک طرف اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ تعلیم دی کہ نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی مرکز پر جمع ہو کر ابناء جنس کی خدمت کرنا چاہئے تو دوسری طرف علوم کی ترقی کے لحاظ سے اس نے تمام مظاہر فطرت کو انسانی کے تصرف میں دے کر گویا یہ بتا دیا ... ... کہ انسان حقیقتاً نام ہے اس قوت عمل کا جو لانہایت تک برابر اسباب ترقی کا ساتھ دیتی چلی جاے۔ یقیناً اصلاحی تحریکوں کی تاریخ ارتقار میں یہ تبلیغ ایک آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اور زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اس کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا

اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسلک کا حقیقی پیام یہی ہے جو بیان کیا گیا تو دنیا کے افراد اس کے ماننے سے کیوں احتراز کرتے ہیں اور اس کے متبعین کے زوال و انحطاط کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ غیر جماعتیں اس سبب کو اس کی تعلیمات میں ڈھونڈھتی ہیں اور میں اس کی تاریخ میں پاتا ہوں۔ یعنی وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس کے اصول تعلیم ہی ایسے ناقص و نامکمل ہیں کہ اس کے متبعین زمانہ کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے پستی کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اور میرا دعوے یہ ہے کہ اس انحطاط کا سبب ہی یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا جس کے بہت سے اسباب تاریخ میں مل سکتے ہیں۔

جس وقت آپ نوع انسان کی ذہنی یا اخلاقی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جب تک کسی قوم یا جماعت کا کوئی مُصلح ان کے اندر موجود رہتا ہے ایک عام انقیاد و اطاعت اور اقدام عمل کے سوا کوئی صورت اختلاف کی پیدا نہیں ہوتی، لیکن جس وقت وہ اٹھ جاتا ہے تو رفتہ رفتہ قوائے عمل کی حرکت مضمحل ہونے لگتی ہے اور اسی کے ساتھ اختلاف آرا پیدا ہونے لگتا ہے جو اجتماعی روح کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخوت و ہمدردی، عدل و مساوات کا جذبہ ضعیف ہو کر ملوکیت و استبداد کی بنیاد پڑنے لگتی ہے اور انسانی برتری کا معیار، اخلاق نہیں بلکہ جاہ و ثروت، دنیاوی

نمود و نمایش قرار پا جاتا ہے اور آخرکار ہر ہر فرد خود غرضی، نفسانیت اور ذاتی آسائش جسم و جان کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھنے لگتا ہے۔ یعنی ایک وقت تو وہ ہوتا ہے جب روئے زمین پر ہر سانس لینے والے انسان کے سامنے تعلیم اخلاق و اصلاح پیش کی جاتی ہے اور ہر شخص آزادی کے ساتھ سوچنے سمجھنے کے بعد شمع یقین اپنے دل میں روشن کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے اور پھر دوسرا وقت وہ آتا ہے جب خود اپنے افراد کو بھی اس کے اندر پناہ لینے کی جگہ نہیں ملتی، اور اپنی کمزوریوں، اپنی نااہلیوں کا اندیشہ اسقدر غالب آجاتا ہے کہ ان کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں ہوتا، یہی وہ منزل ہے جس کی طرف غالب نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ

ناروا بود بہ بازار جہاں جنس وفا
رونقے گشتم و از طالع دکاں رفتم

یہی سبب ہے کہ آج ہماری قومی و اجتماعی حیات، ہماری مذہبی و اخلاقی زندگی، ہمارا اقتصادی و معاشرتی نظام، الغرض ہماری ہر ہر چیز خواہ وہ کسی شعبۂ حیات سے متعلق ہو اور کسی نظام زندگی سے وابستہ بالکل ویسی ہی ہے جیسے اندھوں کی وہ نزاع تنقیدی جب ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے مختلف اعضاء کو ٹٹولنے کے بعد اس کی ماہیت کا اندازہ لگایا، اور ہر ایک نے اپنی جگہ اپنے آپ کو سچا باور کر کے دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کیا، درانحالیکہ ہاتھی کی حقیقت کو ان کے اعتقاد و یقین سے دُور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔

آج جس چیز کو ہم یقین کی صورت سے پیش کر رہے ہیں وہ محض وہم و گمان ہے، آج جن باتوں کو ہم حقایق و مسلمات کہکر بیان کر رہے ہیں وہ صرف مزخرفات دترہات ہیں۔ دُنیا نئی ہے اور اس کے اصول نئے، زندگی نئی ہے اور اس کے امیال و عواطف نئے، پہلے سانس لینے کا طور اور تھا، اب جینے کی راہیں اور ہیں، اب سے ایک صدی قبل جو انسان پیدا ہوتا تھا اب نہیں پیدا ہوتا اور پہلے عقل انسانی کے جو جو خانے مقفل نظر آتے تھے، اب بالکل کھلے ہوئے ہیں، ذہن و دماغ جن زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے وہ اب ٹوٹ رہی ہیں، فراست انسانی آزاد ہے، اور اب اسی شخص کو یہاں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، جو آزادی کے ساتھ سوچ سکتا ہے، جو آزادی سے بول سکتا ہے، جس نے آزادی ہی کے لئے مرنا اور جینا اپنا شعار قائم کر لیا ہے، اور جو دنیا کی آزاد فضا میں آزادانہ مسرور سانس لے رہا ہے ـــــ

پھر کیا انسان کی یہ مسرت اس لئے ہے کہ وہ مذہب و اخلاق کی بندشوں سے چھوٹ کر بہیمانہ اخلاق اختیار کرنے کے لئے آزاد ہو گیا ہے۔ کیا یہ جذبۂ سرور اس بنا پر ہے کہ خونخواری و درندگی سے باز رکھنے کے لئے اس کے ناخن و چنگال کو قطع کرنے والی قوت کوئی باقی نہیں رہی ـــــ نہیں ـــ یہ مسرت صرف اِس لئے ہے کہ آج بالکل پہلی مرتبہ وہ خدا کو بے نقاب دیکھ رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس نے آزادی کی پوجا کی اس نے خدا کی پرستش کی کیونکہ قدرت کا یہی مظہر ہے

جو انسان کو انسان اعلیٰ (Superman) یا خدا کا نائب و خلیفہ بنا دینے والا ہے

پھر آج ہندوستان جس دَور سے گزر رہا ہے وہ اسقدر نازک و اہم ہے کہ شاید ہی کبھی اس سے قبل ایسا دَور اس پر آیا ہو۔ اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے لئے کہ انکے تو حیات و ممات کا سوال سامنے ہے ـــــ اس لئے کیا حقائق بالا کو سامنے رکھ کر اب بھی کوئی راہ عمل نہ ڈھونڈھی جائے گی

ملک کی بڑی آبادی حصول آزادی کے لئے جنگ کر رہی ہے اور اس کے اکثر افراد جن میں تقریباً ہر طبقہ و جنس کے لوگ شامل ہیں ایک متحدہ قوت کے ساتھ اِس فطری حق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ پھر چونکہ ہمیشہ اس نوع کی بیداری کا ایک ہی نتیجہ ہوا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ موجودہ تحریک ناکامی پر ختم ہو۔

مسلمانوں کی جماعت ممکن ہے اپنی فکر و خیال سے اس تحریک کی ہمنوا ہو، لیکن عملاً وہ اس میں کوئی حصہ نہیں لے رہی ایسا کیوں ہے؟ کیا مسلمان ملک کی آزادی کو پسند نہیں کرتے، کیا وہ نہیں چاہتے کہ ملک کے نظم و نسق کا موجودہ آئین بدل جائے اور وہ خود اپنے ملک کی دولت کا صحیح مصرف سوچ سکیں ـــ یقیناً وہ ایسا چاہتے ہیں اور کون ہے جو اپنے فلاح و بہبود کی تمنا نہیں کرتا۔ لیکن وہ اس میں عملی حصہ اس لئے نہیں لیتے کہ اس تحریک کو وہ بالکل فرقہ دارانہ تحریک سمجھتے ہیں اور انھیں اندیشہ ہے کہ حکومت کو چھوڑ کر اس خیال کو تقویت پہونچانا کہیں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنا جانا نہ ہو۔

یہ صحیح ہے کہ اس قسم کا اندیشہ بالکل بے وجہ نہیں، اور ہندؤں کی اجتماعی و اقتصادی، علمی و سیاسی قوت جتنی بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کی پروا کرنے کے لئے تیار نہیں اور وہ یقیناً ایسا ہی نظام چاہتے ہیں جس کا مفہوم ہندو راج ہو سکتا ہے ـ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آج کل میں مسلمانوں کی موجودہ روش اس فتنہ کو روک سکتی ہے، کیا ان کا "کپڑے چڑھائے ہوئے پائنچے اٹھائے ہوئے" چلنا اس سیلاب کے خطرہ کو دُور کر سکتا ہے؟

اس وقت مسلمانوں کی بعض کارکن جماعتیں یہ اعتقاد و یقین رکھتی ہیں کہ اگر انھوں نے گول میز کانفرنس کو اپنے اختلاف سے ناکام بنا دیا اور حکومت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا تو وہ اس نازک وقت سے محفوظ نکل آئیں گی، اور ہندؤں کا خواب آزادی بے معنی ہو کر رہ جائے گا

مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کیونکہ نگاہ غائر نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا ہے کہ "گاندھی، اِرون" مفاہمت کا واقعہ حقیقتاً شیر برطانیہ کی طرف سے اوّلین اعتراف تھا "فیل ہندوستان" کی قوت کا اور انجام بین نگاہیں اسی وقت سے صلیبی پرچم کو آہستہ آہستہ ستون سے نیچے اُترتا ہوا دیکھ رہی ہیں۔ اس لئے اگر تاریخ عالم اور خصوصیت کے ساتھ حکومت برطانیہ کی تاریخ کا یہ کوئی نیا واقعہ نہیں کہ اس نے ہمیشہ قوت کے سامنے اپنے سر کو جھکا دیا ہے، تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا

ہم کو اپنی ہستی تسلیم کرانے کے لئے اس کے علاوہ کسی اور نظریہ کو استوار کرنے کی ضرورت ہے۔

کیا اس کی تدبیر یہی ہونا چاہئے کہ عبد المجید خاں کو دوبارہ خلیفہ بنا کر خلافت کے فتنہ کو پھر تازہ کیا جائے (جواب علاً بالکل ناقابل عمل ہے) اگر یہی ہے تو اسی کی کوشش کرو اور دیکھو کہ مصر و شام، ترکی و فلسطین، عرب و عجم، مشرق و غرب سب کی نگاہیں تمھیں کس ذلت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور یہ جو "پان اسلامزم" کے مکر و فریب کو عقریت کی شکل دے کر پھر پیش کیا جا رہا ہے وہ کیسی شرمناک ناکامی ثابت ہوتا ہے

یہ نہیں تو کیا دوسری تدبیر یہ ہے کہ اپنی قسمت کا فیصلہ حکومت کے ہاتھ میں دے دیا جائے — بہتر ہے یہ بھی کر دیکھو، زمانہ تم کو خود بتائے گا کہ نتیجہ کیا ہوا اور اعتبار و اعتماد کی دنیا میں شاید ہی کسی ایسی ذلیل پامالی کی مثال مل سکے جو اس طرح قائم ہونے والی ہے۔

اگر مسلمان اپنے آپ کو نصاریٰ کی حمایت میں دیدینے کے بعد اپنی فلاح کا یقین رکھتا ہے تو اس سے زیادہ نامعقول ولایعنی، اس سے زیادہ مہلک و سفیہانہ اور اس سے زیادہ واقعات تاریخ اور تجربات ماضیہ کو جھٹلانے والا یقین شاید ہی کسی دل میں پیدا ہوا ہو۔

گزشتہ ربع صدی کی تاریخ ایسی کہنہ و فرسودہ نہیں جو فراموش ہو جائے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہندوستان میں اصلاح حکومت کا سوال کب اور کن حالات کے ماتحت پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ ملک کا مطالبہ کس قدر شدید ہو گیا پھر اگر آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ حکومت کو آخر کار ہر مطالبہ پورا کرنا پڑا، تو کوئی وجہ نہیں کہ جس طرح برسوں کا مطالبہ کل پورا ہوا ہے، اسی طرح آج کا مطالبہ برسوں نہ پورا کیا جائے۔

ہر چند یہ اعتراض.... کہ ملک کے یہ مطالبے صرف اس وقت پورے ہوئے جبکہ مسلمان بھی اس میں برابر کے شریک تھے، کوئی اہمیت و صداقت نہیں رکھتا، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو صحیح مان لیا جائے تو بھی اصل مسئلہ کی اہمیت بدستور اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور کوئی معقول وجہ نہیں پیش کی جا سکتی کہ جب ملک کے مطالبۂ آزادی سے مسلمانوں کو انکار نہیں تو وہ کیوں اب ہندوؤں کا ساتھ چھوڑ دیں۔

اگر مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہے کہ ہندو آزاد ہو کر انھیں فنا کر دیں گے تو اس کے متعلق اگر میں یہ نہ کہوں کہ اب حکومت کی امداد بھی اس کا مداوا نہیں ہو سکتی، تو کم از کم مجھے مسلمانوں کی اس غیرت و خودداری پر ضرور ماتم کرنے دیجئے کہ ایک وقت وہ تھا جب ایک مسلمان اپنے آپ کو سو پر بھاری سمجھتا تھا یا اب وہ زمانہ آیا ہے کہ آٹھ اور بائیس کی نسبت بھی اس کے جسم میں کپکپی پیدا کر رہی ہے،

اچھا آئیے تھوڑی دیر کے لئے دنیائے شرم و غیرت کے اس احساس کو بھی نظر انداز کیجئے اور معاملہ کو معاملہ ہی کی طرح سمجھنے دیجئے تو بھی اس کا کیا جواب ہے کہ آپ ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر کیوں اس مقصد کو حاصل نہیں کرتے جس کا

اعلان آپ متعدد بار کر چکے ہیں۔ جب سوال ڈومی نین ہوم رول کا تھا تو آپ نے نہایت ہی کبر و غرور کے ساتھ اس سکندرانہ جذبہ کا اظہار فرمایا کہ آزادی کامل سے کمتر چیز ہمارے یہاں "بہ جوے نمی ارزد" لیکن آج جب خود گاندھی جی اس آزادی کامل پر اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ

کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست

——ہمیں تو ڈومی نین ہوم رول چاہئے اور حکومت برطانیہ کا ظل ہمایوں کہ نجات کا اصل راستہ یہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت گاندھی جی کی صرف ایک سیاسی چال نے ان کے چہروں کے ایک ایک خط و خال کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر کے رکھ دیا اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ اب وہ کون ہے جو ان کے خلوص نیت پر اعتماد کرے گا۔

گاندھی جی کا مسلمان نمایندوں سے یہ کہنا کہ وہ ان کے تمام مطالبات ماننے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ وہ کانگرس کے اغراض سے متفق ہو جائیں اسی علم و یقین کی بنا پر تھا کہ وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوں گے۔ اور اس لئے اس سے بہتر صورت ان کے بطون کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کی اور کوئی نہ ہو سکتی تھی۔

بہر حال اب وقت نہ ماضی کی داستانوں پر تبصرہ کرنے کا ہے اور نہ آیندہ کے لئے صبر و انتظار کا۔ جو فیصلہ ہونا تھا ہو چکا دست خدا کو جو کچھ لکھنا تھا، لکھا جا چکا اور—— یقیناً تباہی ہے اس جماعت و قوم کے لئے جو اس فیصلہ سے روگردانی اختیار کرے ——

اگر مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا نہیں چاہتے، تو بہتر ہے وہ اپنا عزم و ثبات خود علیحدہ قائم کریں، اپنی راہِ عمل خود متعین کریں، کیونکہ جب منزل مقصود ایک ہو تو پھر دو جماعتوں کا دو مختلف راستوں سے وہاں تک پہونچنا، قابل اعتراض امر نہیں —— لیکن معاف فرمائیے اگر آپ کا مقصود اس اختلاف سے صرف راستہ میں ناہمواریاں پیدا کرنا ہے، تو یاد رکھیئے کہ آج تک دنیا میں کوئی سیلاب اس ترکیب سے روکا نہیں جا سکا بلکہ ان عارضی بندشوں نے ہمیشہ اس کو اور زیادہ پرشور بنا دیا اور آخر کار تمام موانع اس طرح نیست و نابود ہو کر رہ گئے گویا وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔

اگر مسلمان واقعی ملک کی آزادی کے متمنی ہیں تو اس کا طریق کار اگر یہ نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں کے دوش بدوش کام کریں تو یقیناً اس کی تدبیر یہ بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ حکومت کے سامنے دست سوال دراز کریں اُس حکومت کے سامنے جس کا مفاد اب بھیک دینے میں نہیں بلکہ ایسے حقیر و ذلیل بھکاریوں کو ٹھکرا دینے ہی میں پنہاں ہے۔

پھر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ مسلمان میدان عمل میں آجائیں اور ہندوؤں سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ لیکن اسی امن و سکون کے ساتھ جس کی جستجو کیجا رہی ہے اور اسی مصلحانہ جذبہ ایثار و فدیت کو لئے ہوئے جو خونریزی کا دشمن ہے، جو امن شکنی کا مخالف ہے اور جو کسی کو ایذا پہونچانا مذہبی و اخلاقی گناہ سمجھتا ہے، یہ جنگ ہے بیدست و پاکی صاحب عظمت و جبروت کے مقابلہ میں، ایک بے سروساماں کی صاحب برگ و ساز کے مقابلہ میں یہ جنگ ہے صرف اخلاق کی جسمیں صرف جان دیجاتی ہے۔

(بقیہ ملاحظات صفحہ ۹۵-۹۶ پر)

کاروبار کی موجودہ سرد بازاری کے اسباب

اور اُن کا علاج

ہر دوکان دار اور کاریگر کو آج اس بات کی شکایت ہے کہ اس کے مال کی نکاسی کم ہو گئی ہے۔ اسٹاک بھرا پڑا ہے، روپیہ پھنسا ہوا ہے۔ دوکان کا کرایہ نہیں نکلتا، قرض خواہ کا سود بڑھ رہا ہے۔ مزدوری گراں ہو گئی ہے۔ جنگی ٹیکس، بجلی کا بل ادا کرنا دشوار ہے۔ پھر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حالت صرف ایک شہر یا صوبہ یا ملک تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ وبا عالمگیر ہے۔ یورپ و امریکہ کے لاکھوں آدمی بے روزگار ہو گئے ہیں اور کارخانے بند پڑے ہیں۔ حکومتوں کے بجٹ پر بھی اس کا بہت بُرا اثر پڑا ہے۔ اس لئے ملازموں کی تخفیف اور اضافہ محاصل کی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ بنکوں کے بھی دوالے نکل گئے ہیں یہ سب آخر کیوں ہے۔ کیا اس کے کوئی مستقل اسباب ہیں یا یہ سب ناقابل فہم اسرار ہیں۔

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے یہاں کی تمام آبادی زمین سے پیداوار حاصل کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ اور زمین ہی کی آمدنی پر انحصار کرتی ہے۔ کاشتکار ہی زمین دار کو لگان، ساہوکار کو بیاج اور سرکار کو مالگذاری و آبیانہ ادا کرتا ہے۔ وہی مقدمے لڑ کر اسٹامپ اور کورٹ فیس داخل کرتا ہے۔ وکیلوں، مختاروں، کارندوں، عرائض نویسوں، پیشکاروں، اہلکاروں، پٹواریوں جیبیں بھرتا ہے۔ نمک و شراب کا استعمال کر کے سرکار کی آمدنی بڑھاتا ہے۔ جاترا و اشنان کو جا کر ریل کی آمدنی میں اضافہ کرتا ہے ڈاکخانہ و تارگھر کی رونق بھی اُسی کے دم سے قائم ہے۔ میلوں اور نمائشوں کی آبادی کا بھی وہی سبب ہے۔ اُس پر اگر کوئی آفت آتی ہے۔ تو ساری قوم پر آفت آجاتی ہے وہ خوش حال رہتا ہے تو ساری قوم خوش حال رہتی ہے۔ زمیندار و ساہوکار، حکام و تجار، بڑے بڑے شہروں میں عیش و مسرت کے لُطف اٹھاتے ہیں۔ ہر شخص کے دل میں امنگ و ولولہ ہوتا ہے۔ روپیہ دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے۔ محل و مکانات تعمیر ہوتے ہیں، مکان کی آرائش و زیبائش میں روپیہ صرف ہوتا ہے۔ کپڑوں کے جوڑے پر جوڑے تیار ہوتے ہیں۔ زیور بنتے ہیں۔ سواری ایک سے ایک بہتر رکھی جاتی ہے۔ خوشیاں و شادیاں منائی جاتی ہیں۔ سفر کئے جاتے ہیں ہوٹل آباد ہوتے ہیں۔ غرضکہ ایک کاشتکار کے دم سے ہر طرف چہل پہل نظر آتی ہے اور دنیا کی رونق اسی کی ذات پر منحصر ہے۔

گذشتہ چند سال سے اس غریب کاشتکار کو (جس کے کمزور شانے شہروں کی تمام تہذیب و شائستگی کے وزن کو سنبھالے ہوئے تھے) پے درپے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ۱۹۲۸ء میں خشک سالی رہی۔ ۱۹۲۹ء میں ٹڈی دل اور سیلاب نے فصل خراب کردی اور ۱۹۳۰ء میں جب پیداوار ذرا اچھی ہوئی تو قیمتیں گرنا شروع ہوگئیں۔ اور ۱۹۳۱ء میں قیمتوں کے زوال کا یہ عالم ہوا کہ لوگوں کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ یہ برابر گرتی چلی جائیں گی اور انھیں ٹھہرنے کے لئے کوئی ٹھوس جگہ نہ ملے گی۔

کاشتکار ایک طرف اپنی لاگت و محنت پر نظر کرتا تھا، زمیندار، ساہوکار اور سرکار کے شدید تقاضوں کو سنتا تھا اور دوسری طرف قیمتوں کی گری ہوئی حالت دیکھتا تھا۔ اور خاموش تھا۔ غلّہ کے انبار اس کے کھلیان میں لگتے جارہے تھے۔ اور تھوک بازاروں اور آٹا پیسنے والی ملوں میں اسٹریلیا کے غلّہ کی یورش تھی۔ اور اسی تناسب سے غلہ کی قیمت برابر گھٹتی چلی جارہی تھی۔ یہ سب آخر کیوں تھا۔ ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں تو اسٹریلیا کا غلّہ اس لئے بہت ہندوستان میں آیا کہ یہاں خشک سالی کی وجہ سے غلّہ کی مانگ زیادہ تھی اور غلّہ نسبتاً گراں تھا۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں تو غلّہ کی پیداوار یہاں بڑی اچھی تھی۔ اور نرخ سستا تھا۔ پھر آسٹریلیا سے غلّہ آنے کا کیا سبب ہوا تھا۔ ہم تو خود اپنا غلّہ اور زرعی پیداوار باہر بھیجتے تھے۔ اور دنیا میں اس کی مانگ رہتی تھی۔ اب دنیا کی مانگ کو کیا ہوگیا۔ کہ وہ اپنا زائد از ضرورت غلّہ خواہ مخواہ ہمارے سر منڈھ رہی ہے۔ دنیا کی آبادی میں کمی نہیں ہوئی بلکہ دس فیصدی کا اضافہ بتلایا جاتا ہے پھر کیا سبب ہوا؟

اس کا سبب ایک نہیں، متعدد اسباب بتائے جاتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک تفصیل کا محتاج ہے پہلے میں اجمالی طور پر نمبروار اُنھیں درج کرتا ہوں اور پھر اُن کی تفصیل بیان کروں گا۔

(۱) زرعی پیداوار کی اسٹریلیا، کنیڈا، ارجنٹائن، امریکہ اور بالشوک روس میں زیادتی۔

(۲) صنعتی و حرفتی پیداوار کی ہر ملک میں زیادتی

(۳) مال کی آمدورفت پر امتناعی محاصل اور صنعت و تجارت میں ایک کی دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش

(۴) سونے کی رسد میں کمی

(۵) گورنمنٹ کی اکسچینج پالیسی

(۶) گورنمنٹ کے اخراجات و محاصل میں زیادتی

(۷) جرمنی کے تاوان جنگ کا مسئلہ

(۸) مال کی نکاسی میں کمی اور لوگوں کی طلب میں کمی

(۹) چین و ہندوستان میں بے امنی و خانہ جنگی۔ قومیت کا ارتقا۔ اور تمام قوموں میں مزدور پیشہ جماعت کی تنظیم۔ سرمایہ داروں اور بنکوں کی بے اطمینانی و بے توجہی۔

(۱) زرعی پیداوار کی آسٹریلیا وغیرہ میں زیادتی کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ وہاں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ آسٹریلیا۔ کنیڈا۔ ارجنٹائن امریکہ یہ سب نئی آبادیاں ہیں۔ یورپ، ایشیا و افریقہ کے شمالی ممالک کی طرح اُن کی آبادی بہت پُرانی نہیں ہے۔ بالشوک روس گو یورپ و ایشیا میں شامل ہے۔ لیکن وہ ایک سخت انقلاب انگیز فلسفہ کے ماتحت اپنی قومی زندگی کو ترتیب دے رہا ہے اور اس لئے وہاں کی حالت بھی دیگر قدیم ممالک کی طرح نہیں ہے۔ پہلے ہم نوآبادیوں کی زیادتی پیداوار کے اسباب بیان کریں گے۔ اس حقیقت کا ہر شخص کو تجربہ ہے کہ اگر زرخیز زمین افتادہ پڑی رہی تو اس کی زرخیزی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نوآبادیوں میں ایسی ہی زرخیز زمین سالہا سال سے افتادہ و غیر آباد پڑی ہوئی تھی جسے صاف و ہموار کر کے یورپ کی نوآبادی بسانے والوں نے قابل زراعت بنایا۔ پھر یہ کہ ابتدا میں کاشت کرنے والے اور دعوے دار کم تھے۔ اور زمین لامحدود تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص کی جوت میں رقبہ بہت کافی آگیا۔ بڑے بڑے فارم بن گئے۔ جن پر سرمایہ خوب لگایا جا سکتا تھا۔ اور مشینری اور موٹر ٹریکٹر سے کام کرنا ممکن تھا۔ پھر جب آبادی بڑھی تو صنعت و حرفت میں ترقی شروع ہو گئی اور اس طرح زرعی زمین پر آبادی کا دباؤ بہت نہ بڑھ سکا۔ صنعت و حرفت کی ترقی سے سرمایہ میں اضافہ ہوا اور یہ سرمایہ زرعی زمین کی حالت بہتر بنانے میں بھی صرف ہوا۔ جن لوگوں نے نوآبادیاں بسائیں اور اپنا قدیم وطن چھوڑ کر سمندر پار لاکھوں میل کا سفر اختیار کیا۔ اور ایک نئے ملک میں جن مصائب، پریشانیوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اونہیں برداشت کیا، ظاہر ہے کہ وہ آدمی غیر معمولی مستقل مزاج، جفاکش اور محنتی ہوں گے۔ پھر ان میں سے بہت سے اُن دلیر اور راسخ العقیدہ لوگوں کی اولاد ہیں۔ جنہوں نے اپنے ملک سے ہجرت گوارا کر لی۔ لیکن اپنے اُن عقائد کو ترک نہیں کیا جن کے چھوڑنے پر وہ مجبور کئے جا رہے تھے۔ عملی تعلیم اور تمدن و تہذیب کی خوبیاں وہ اپنے ساتھ لے گئے اور بُرائیاں اپنے وطن میں چھوڑ گئے۔ فطرت کی فیاضیوں نے اُن کے حوصلے بڑھائے ہر محنت کا اُس سے کئی گنا انہیں صلہ ملا۔ اور انہیں دنیا میں کسی چیز کا امکان محال نظر نہ آیا۔ اس لئے ایجادیں بڑھتی رہیں اور اب ترقی دادہ اصول زراعت ان کے یہاں اس لائق ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے ملک کی ضرورت سے بہت زیادہ پیدا کرتے ہیں۔ اور اپنی پیداوار برآمد کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ سنہ ۳۰ء و سنہ ۳۱ء سے غلہ کے اسٹاک تمام منڈیوں میں بہت زیادہ جمع ہیں اور حکومتوں کے لئے یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ ان کی کس طرح نکاسی کی جائے۔

بالشوک روس کی حالت نوآبادیوں سے مختلف ہے۔ روس میں جنگ عظیم کے دوران میں ایک بڑا انقلاب ہو گیا۔ جس کی وجہ سے وہاں شخصی سلطنت کا اقتدار ختم ہو گیا۔ زمیندار و سرمایہ دار فنا یا شہر بدر کر دیے گئے۔ اور اب صرف مزدور کے مفاد کی نمایندگی کرنے والی ایک جماعت ملک کی تمام زمین و جائداد و املاک کی مالک ہے۔ کسی شخص کو یہ آزادی نہیں ہے کہ وہ جو کام اپنے لئے مناسب سمجھے اختیار کرے بلکہ حکومت ہر شخص کو کام سپرد کرتی ہے۔ اور اس کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہے۔ حکومت نے ایک پنج سالہ اسکیم بنائی ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ روس کی صنعتی و زراعتی پیداوار کو

پانچ سال کے اندر اندر اسقدر ترقی دے دی جائے کہ وہ یورپ و امریکہ کے مہذب ترین ممالک کی مجموعی پیداوار سے اگر بڑھ نہ سکے تو کم از کم برابر ہو جائے۔ جو لوگ روس کی تاریخ سے واقف ہیں۔ اونھیں اس اسکیم کی خام خیالی پر ہنسی آتی ہے۔ روس یورپ کے تمام ممالک میں سب سے زیادہ غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ ملک تھا۔ اس کے باشندے سخت مفلس اور تباہ حال رہ چکے ہیں۔ ایسے ملک کے لئے ایسا پروگرام بنانا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن یہ پروگرام بن گیا ہے اس پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ اسکیم کا تیسرا سال ہے اور زراعتی و صنعتی پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ ہو چکا ہے۔ لیکن روس کے لیے ایک بڑا مشکل مسئلہ مشینری فراہم کرنا ہے جسے وہ خود ابھی تک بنانے سے قاصر ہے۔ روپیہ اس کے پاس نہیں ہے۔ غیر ممالک اُسے قرض دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اس... لئے اس کے پاس بس ایک ہی تدبیر رہ گئی ہے، وہ یہ کہ اپنی زراعتی پیداوار کے معاوضہ میں مشینری حاصل کرے۔ لیکن یورپ کے سرمایہ دار ممالک اس سے ایک سطح پر رہ کر تجارت ...... کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ اس لئے لامحالہ اسے اپنا مال دوسروں کے مقابلہ میں کم داموں پر یورپ کی منڈیوں میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ جس سے مال کی قیمتیں گر جاتی ہیں۔

نوآبادیوں اور بالشوک روس کے علاوہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک زراعت کو قومی زندگی کا جزو لاینفک سمجھ کر ترقی دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اور اپنی زرعی پیداوار بڑھا رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہ ترقی رُونما ہے۔ جیسا کہ محکمۂ زراعت کی رپورٹوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اِس تمام زیادتی پیداوار کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا کی تمام منڈیوں میں زراعتی پیداوار کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اور ان کی قیمت گرتی جا رہی ہے۔

(۲) صنعتی پیداوار کا بھی یہی حال ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے برطانیہ کو صنعت و تجارت میں سب ممالک پر فوقیت حاصل تھی۔ دنیا کے بہت سے ممالک جس میں امریکہ بھی شامل ہے اس کے مقروض تھے۔ جرمنی نے ہمسری کا دعوےٰ کرنا چاہا۔ اور تجارت میں مقابلہ شروع کیا۔ جس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں رُونما ہوا۔ جنگ کے دوران میں مصروف پیکار قوموں کی تمام وہ مشینیں جو پہلے امن و عافیت کے سامان دنیا کے لئے فراہم کرتی تھیں۔ تباہی و غارتگری کے اوزار بنانے لگیں۔ تندرست مزدور جو پہلے کارخانوں میں کام کرتے تھے وہ فوج میں بھرتی ہو کر جنگ کے میدانوں میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ لیکن تمام قومیں جنگ میں شریک نہ تھیں۔ غیر جانبدار قوموں کی بن آئی۔ انھوں نے موقعہ غنیمت جان کر اپنی صنعت و تجارت کو ترقی دینا شروع کی اور وہ خلا جو انگلستان۔ جرمنی۔ فرانس۔ آسٹریا وغیرہ کی مصروفیت جنگ سے پیدا ہوا تھا۔ اُسے پُر کرنا شروع کیا۔ امریکہ و جاپان کی صنعتوں کو ترقی ہوئی۔ امریکہ مقروض کی جگہ قرضخواہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں ایشیا کے وہ ممالک جو یورپ کی اشیا خریدتے تھے۔ انھوں نے یہ محسوس کر کے کہ دوسرے ممالک پر اپنی ضرورت کی چیزوں کے لئے انحصار کرنا۔ نادانی ہے اپنی صنعتوں کو ترقی دینا شروع کی۔ ہندوستان میں بھی صنعت کو خوب ترقی ہوئی۔ جب جنگ ختم ہوئی اور فاتح قوموں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو انھیں معلوم ہوا

کہ اُن کی تجارت پر دوسروں کا قبضہ ہے۔ لیکن اس سے وہ ذرا بھی ہراساں اور دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے یہ سمجھتے آئے تھے کہ انھیں صنعت وتجارت میں قدرتی منافع اسقدر حاصل ہیں کہ ان کی کامیابی یقینی ہے، اس لئے انہوں نے اپنی صنعت وتجارت کی رفتار اسی پیمانہ پر جو جنگ سے پہلے تھی شروع کردی۔ نظام سرمایہ داری میں صنعت وتجارت کی تنظیم کچھ اس ڈھنگ پر ہوتی ہے۔ کہ اس کے اثرات فوراً رونما نہیں ہوتے اور کئی سال کے بعد نفع ونقصان کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب چند سال گذر گئے۔ اور ۱۹۲۱ء کی سرد بازاری کے ایام میں برطانیہ کو معلوم ہوا کہ اس کے حریف ایسے حقیر نہیں رہے ہیں۔ جیسا کہ اس کا خیال تھا بلکہ انہوں نے جنگ کے دوران میں اپنی طاقت کو خوب بڑھا لیا تھا۔ تو بھی برطانیہ کے ماتھے پر شکن نہ آئی۔ اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ گو مقابلہ سخت ہے اور برطانیہ کو اپنی تمام تر کوششیں صنعت وتجارت کی ترقی پر صرف کرنا ہے۔ لیکن صورت حال مایوس کن نہیں ہے۔ عزم، استقلال، ایثار ومحنت کی ضرورت ہے۔ فتح اخیر میں برطانیہ کی ہے۔ پھر کام شروع ہوا۔ نقصانات کی پرواہ نہیں کی گئی پیداوار میں ترقی ہوتی رہی حتے کہ ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۱ء کی عالمگیر سرد بازاری سے اب ہم دوچار ہیں۔ دنیا کے اور دوسرے ممالک نے بھی صنعت کی ترقی کی رفتار میں کمی نہیں کی۔ امریکہ، جاپان۔ فرانس۔ بلجیم۔ کنیڈا۔ آسٹریلیا۔ جرمن واسٹریا۔ مصر وہندوستان ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر قائم رہنا چاہتا ہے۔ اور دنیا کی پیداوار میں اس طرح اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ اور اب ہر جگہ تھوک وخردہ بازار میں صنعتی چیزوں کے انبار لگے ہوئے ہیں جن کا خریدار کوئی نہیں ہے۔ کارخانوں کو مجبوراً اپنی پیداوار بند کرنا پڑی ہے۔ جس کی وجہ سے عالمگیر بے روزگاری ہے۔ حتے کہ امریکہ بھی اس بے روزگاری میں برابر کا شریک ہے۔ سوتی داونی وریشمی کپڑا، لوہا واسٹیل، مشینری۔ موٹر، چینی وشیشہ کے ظروف، جنرل اسٹورس جوتے وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیز کی رسد مانگ سے زیادہ ہے۔ اور بڑے چھوٹے سب دوکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

(۳) مزدور، دوکاندار، کارخانہ کے مالک، زمیندار، کاشتکار جب سب پر آفت ہے اور مصیبت عام ہے تو افراد، اجتماعی صورت پر اپنی مشکلات کا حل چاہتے ہیں اور حکومت سے مدد کے خواستگار ہوتے ہیں۔ اس مصیبت سے قبل، حکومت سے ایک دوسری شکل میں مدد چاہی گئی تھی۔ گورنمنٹ سے کہا گیا تھا کہ قوم کی صنعت وحرفت خطرہ میں ہے اس لئے ضرورت محافظت کی ہے۔ محافظت کی صورت یہ ہونا چاہیے کہ (الف) ملک کا بازار ملک کی بنی ہوئی اشیاء کے لئے محفوظ رہے۔ اور یہ امتناعی محاصل سے ممکن ہے (ب) ایسی اشیاء کی پیداوار میں سہولت بہم پہونچائی جائے۔ جن کا برآمد کرنا۔ ہم دوسرے ممالک میں اپنی تجارت کی ترقی کے لئے ضروری سمجھیں۔ اور یہ ریل کے کرایہ کی کمی اور براہ راست مالی اعانت (مثلاً گرانٹ، سبسڈی اور باونٹی) دیے جانے سے ممکن ہے (ج) گورنمنٹ اس طرح بھی مدد کرسکتی ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی چیزیں ملکی کارخانوں سے زیادہ دام دے کر خریدلے۔ جہاں قومی حکومتیں تھیں۔ وہاں یہ سب طریقے اختیار کئے گئے۔ اور ملک کی صنعت وتجارت کو محفوظ کیا گیا۔ امریکہ و دیگر نو آبادیا

اور جرمنی عرصہ سے اس پالیسی پر کار بند ہیں۔ لیکن انگلستان کے تجارتی و صنعتی طبقہ نے اس قسم کی حکومت کی امداد کو حتی الوسع ناپسند کیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر تمام دنیا میں اس وقت تجارت کی آزادی ہو جائے اور حکومتوں نے اپنی پالیسی سے جو تجارت میں رکاوٹیں و بندشیں پیدا کر دی ہیں، وہ اگر اٹھا دی جائیں تو انگلستان اب بھی صنعت و تجارت میں تمام ممالک پر فوقیت حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے اس قسم کی محافظت، بقاء ذاتی کے نقطۂ نگاہ سے اِن ملکوں کے لئے قطعاً ناگزیر تھی۔ لیکن حکومتوں کی ان تمام کوششوں کے باوجود جس میں اب انگلستان کی حکومت بھی شریک ہوتی جا رہی ہے۔ آج دنیا کا کوئی ملک اپنی صنعت و تجارت کے قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ ہر ایک کو یہ اطمینان ہے کہ اگر میں کامیاب نہیں ہوں تو میرا حریف بھی کامیاب نہیں ہے۔ اور اب اس جنگ نے ایک منتظرہ شکل اختیار کر لی ہے۔ ہر ملک یہ دیکھ رہا ہے۔ کہ میرے حریف میں کتنا دم ہے۔ اور کہاں تک سختی جھیل سکتا ہے۔ جنکا کم دم ہے وہ بازی ہار جائیں گے۔

(۴) اسی سے ملتا جلتا اور حکومتوں کی پالیسی پر بڑی حد تک انحصار کرنے والا مسئلہ سونے کی رسد اور اکسچینج کے نرخ کا ہے۔ یہ مسئلہ اسقدر پیچیدہ اور دلچسپ ہے کہ یہ ایک مستقل مضمون علیحدہ چاہتا ہے۔ لیکن جسقدر مختصر طریقہ پر بیان کیا جا سکتا ہے یہاں اس کے بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ سونے کو بین الاقوامی مارکٹ میں ایک بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ سونا ایسی دھات ہے جسے زنگ نہیں لگتا ہوجو نہیں گھستی۔ اور ایک دفعہ پیدا ہو جانے کے بعد بہت کم فنا ہوتی ہے۔ اسوجہ سے سونے کا اسٹاک دنیا میں بہت جمع ہو گیا ہے۔ اور اس کی قیمت کا جو تناسب عالم کی تمام اشیاء کے مقابلہ میں قائم ہو گیا ہے اُس میں معتد بہ تبدیلی اس کی پیداوار کی کمی و زیادتی کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ اگر ایک دریا میں ایک نالے کا پانی آگرے تو اوس کی سطح اس نئے پانی کے اضافہ سے بلند نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح دنیا کی تمام کانوں سے جو سونا نکلتا ہے وہ دنیا کے سونے کے اسٹاک میں مختصر مدت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اس کی رسد نہ تو بہت مختصر ہے نہ بہت زیادہ۔ ہر شخص تھوڑا بہت سونا رکھ سکتا ہے۔ لیکن ہر شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا ایک کثیر ذخیرہ رکھ سکے۔ اس لئے ہر شخص اسکا متمنی رہتا ہے۔ حکومتوں نے لوگوں کی سونے کے لئے اس عالمگیر تمنا کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ تمام اشیاء کی قیمتوں کے تعین کے لئے ان کا مقابلہ سونے کے ایک مقررہ وزن سے کیا جائے۔ جیسے . . . گز لوہے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اور اس سے لاکھوں گز کپڑا ناپا جاتا ہے یا سیر لوہے کا ایک وزن ہوتا ہے۔ اور اس سے لاکھوں کروڑوں من چیز تولی جاتی ہے۔ اسی طرح سونے کے ٹکڑے کا کوئی خاص وزن لے کر اس کا سکہ بنا دیتے ہیں۔ اور اس سے لاکھوں کروڑوں روپیہ کے کاروبار کا سودا ہوتا ہے۔ اور سکہ بنانے کا کام، جو اس بات کی گارنٹی ہے کہ سکہ میں کھرا سونا مقررہ وزن کا ہے۔ گورنمنٹ اپنے ذمہ لے لیتی ہے۔ جیسے گز اور سیر اور دوسرے پیمانے مقرر کرنا گورنمنٹ کا فرض ہے۔ اس سے صورت حال یہ ہو جاتی ہے کہ ایک طرف تمام عالم کی

چیزیں ہوتی ہیں اور دوسری طرف انہیں چیزوں میں کی ایک چیز ہوتی ہے۔ جس کی قیمت انھیں کی طرح طلب و رسد کے اصول پر متعین ہوتی ہے۔ فرق یہ ہو جاتا ہے کہ اس کی طلب کا انحصار تمام عالم کی اشیا کی رسد پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر یہ رسد زیادہ ہے تو اس کی قیمت (دوسرے اثرات کو۔ ہم یہاں نظر انداز کرتے ہیں) زیادہ ہوتی ہے اور اگر یہ رسد کم ہے تو اسکی قیمت کم ہوتی ہے۔ خود سونے کی رسد سے جو قیمتوں میں تبدیلی ہوتی ہے۔ جس طرح گز اور سیر کی چھوٹی تقسیمیں فٹ، انچ، اور ادھ سیرا، پوا اور چھٹانک میں کی جاتی ہیں اسی طرح سونے کے سکے کی تقسیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن سونا چونکہ بہت زیادہ ہر دلعزیز چیز ہے اس لیے اس کے استعمال میں ذرا کفایت شعاری سے کام لیا جاتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ اختیار کی گئی ہے کہ سونے سے ادنٰے درجے کی دھاتیں مثلاً چاندی وغیرہ کے سکہ انھیں شرائط پر جن پر سونے کے سکے بنائے جاتے ہیں۔ بنائے گئے اور اُن سے کام چلایا گیا۔ جب تک لوگ غیر مہذب تھے۔ اور حکومتوں میں جلد جلد انقلاب ہوتے رہتے تھے۔ سکے اپنی دھات کے وزن کی قیمت پر بازار میں چلتے تھے۔ لیکن جب امن و امان قائم ہوا۔ حکومتیں شخصی کی جگہ قومی اور اس لئے پائدار ہو گئیں۔ علاوہ ازیں چاندی اور دیگر دھاتوں کی پیداوار میں اس قدر زیادتی ہو گئی کہ انکی قیمتیں روز بروز بے انتہا گھٹنے لگیں۔ اور صورت حال ایسی ہو گئی کہ جیسے ایک ریتیلے پتھر کا ادھ سیرا بنا لیا جائے اور اس سے سودا تولا جائے اور وہ برابر گھستا چلا جائے تو اس سے کاروبار پر بہت بُرا اثر پڑنے لگا۔ خریداروں و قرضخواہوں کو بڑا نقصان ہوتا تھا۔

رائج الوقت سکہ میں لوگوں کی آمدنیاں، مزدوری، تنخواہ، لگان سود۔ مالگزاری اور گورنمنٹ کے اور تمام محاصل سب ایک مدت کے لئے جس کا معاہدہ ہو جاتا ہے۔ مقرر کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن اگر چاندی کی پیداوار اور رسد میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے۔ اور لوگ اس چاندی کا سکہ بنوالیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ سکہ کی رسد تمام اشیاء کے مقابلہ میں زیادہ ہو جائے گی۔ اور سکہ کی قیمت کم ہو جائے گی جس کے معنی یہ ہوں گے کہ اشیا کی قیمت گراں ہو جائے گی۔ اور جن لوگوں کے مقررہ مطالبات ہیں انھیں نقصان رہے گا۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ لوگوں کو جو چاندی کے سکہ بنوانے کی آزادی حاصل تھی اُسے سلب کر لے۔ اور قیمتوں کو پائداری دینے کے لئے سکہ کی ایک مقررہ رسد مہیا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ جو نہ تو اتنی زیادہ ہوگی کہ چیزوں کی قیمتیں گراں ہو جائیں نہ اتنی کم کہ اس کی قیمتیں گھٹ جائیں۔ بلکہ قیمتوں کو ایک مقررہ سطح پر رکھے تاکہ کاروبار اور گورنمنٹ بجٹ میں بے اطمینانی، گڑ بڑ اور جوئے دسٹے کی کیفیت پیدا نہ ہو۔ لیکن چونکہ ملک کے باہر کی قیمتوں پر گورنمنٹ کو کوئی اختیار نہیں اور بین الاقوامی قیمتیں اخیر میں سونے کی اندرونی اور ذاتی قیمت سے متعین ہوتی ہیں۔ اس لیے گورنمنٹ اس بات کی ذمہ داری لی ہے۔ کہ بیرون ملک کے مطالبات کی ادائیگی کے لئے ایک تناسب سونے اور رائج الوقت چاندی کے سکے میں مقرر کیا کرے گی۔ اور اس پر جب تک ممکن ہو سکے گا۔ ضرور کاربند رہے گی۔ اور

اس مقررہ تناسب کے مطابق ہمیشہ ہر شخص کو سونا دیا کرے گی - اور اس کے لئے اس کے اسٹاک میں ہمیشہ سونا رہے گا - اور یہ سونا اس فرق سے خریدا جائے گا - جو رائج الوقت سکہ کی اصلی واندرونی اور ظاہری وقانونی قیمت میں ہوگا - پھر جب گورنمنٹ پر لوگوں کا اعتماد اور بڑھا تو گورنمنٹ نے یہ خیال کیا کہ چاندی کے سکہ کے لئے روپیہ خرچ کرنا فضول خرچی ہے - جب چاندی کا سکہ محض گورنمنٹ کے قانون وساکھ کی وجہ سے اور اس اطمینان کی بنا پر جب چاہیں اسے سونے میں تبدیل کرا سکتے ہیں - اپنی اصلی قیمت سے زیادہ قیمت پر بازار میں چلتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ گورنمنٹ کا وہی ساکھ ایک کاغذ کے پرزے سے وہی کام نہ لے جو وہ چاندی سے لیتا ہے - گورنمنٹ کو اس پالیسی کے اختیار کرنے میں بنکوں اور صرافوں کی ہنڈیاں دیکھ کر اور زیادہ تقویت ہوئی - گورنمنٹ نے سوچا کہ ہمارا ساکھ یقیناً بنکوں اور صرافوں سے زیادہ ہے - ہمارے پاس قانون کا ہتھیار ہے - جس کے ذریعہ سے ہم اپنا ساکھ بنکوں سے مقابلۃً زیادہ دیر تک قائم رکھ سکتے ہیں - اس لئے انھوں نے کاغذ کے نوٹ چلا دیے - تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا - کہ گورنمنٹ سے پیشتر بنکوں نے اپنے نوٹوں کا اجرا کیا تھا - اور حکومت نے محض بنکوں کی تقلید کی - بہرحال، نوٹوں کی قدر وقیمت بھی موجودہ زمانہ میں ..... اسی اطمینان پر قائم ہے کہ انھیں جب چاہیں سونے میں تبدیل کر سکتے ہیں - اور چیزوں کی قیمتوں اور ہر قسم کے مطالبات کی ادائیگی میں گورنمنٹ کے قانون کے زیر اثر ہر شخص انھیں قبول کرنے پر مجبور ہے - گورنمنٹ نوٹوں کو سونے میں بدلنے کے لئے اپنے خزانہ میں ہمیشہ ایک مقررہ تناسب سونے کا رکھتی ہے - تاکہ اگر نوٹوں کو سونے میں بدلنے کا مطالبہ ملکی یا بیرونی ضرورت کے لئے ہو تو گورنمنٹ اس کو پورا کر سکے - اسی طرح ہر بنک وصراف اپنے اپنے خزانہ میں سونا رکھتا ہے تاکہ وہ سونے کے مطالبات کو پورا کر سکے مگر نوٹ کے اجرا میں گورنمنٹ اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ نوٹوں کی رسد اس قدر زیادہ یا کم نہ ہو جائے کہ انکی وجہ سے اشیا کی قیمتیں گراں یا ارزاں ہو جائیں - بہرحال یہ صورت حال کم وبیش تمام ممالک میں یہ ادنےٰ فرق مراتب رائج ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے - کہ سونے کو دنیا کے کاروبار میں کیا اہمیت حاصل ہے - اور گورنمنٹ اور بنکوں کے نوٹوں دھات کے سکوں، ہنڈیوں، سرخطوں اور دیگر ایسی دستاویزات میں کمی یا زیادتی جن کے ذریعہ سے خرید وفروخت کی جا سکتی ہے ...... کس قدر گورنمنٹوں اور بنکوں کے خزانوں میں سونے کے اسٹاک کی موجودگی پر منحصر ہے - اگر سونے کا اسٹاک ان جگہوں میں کم ہو جائے گا - تو اسی تناسب سے ان تمام آلات تبادلہ کی رسد کم ہو جائے گی - اور ان کی کمی کا اثر اشیا کی قیمتوں پر ہوگا - جو لامحالہ گھٹ جائیں گی - گذشتہ چند سالوں سے اسی تجارتی مسابقت اور حریفانہ تگ ودو کے سلسلہ میں جو برطانیہ، امریکہ، فرانس اور دیگر ممالک میں جاری ہے - امریکہ اور فرانس اپنے حصۂ رسد سے زیادہ سونا، دنیا کے خزانوں سے کھینچ کھینچ کر اپنے خزانوں میں جمع کر کے مقفل کر رہے ہیں - اور اس سے فی الحال کوئی کام سوائے اس کے نہیں لے رہے ہیں کہ اپنے حریفوں کو تنگدست بنائیں - دنیا کی قیمتوں پر اس سونے کی رسد کے کھچاؤ کا یہ اثر ہوا ہے - کہ قیمتیں گرتی جا رہی ہیں -

(۵) اسی سے متعلق مسئلہ شرح مبادلہ یا اکسچینج ریٹ کا ہے - اور یہ ہندوستان کے حالات کے لئے مخصوص دلچسپی رکھتا ہے - جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا - چاندی کی گرتی ہوئی قیمت کو دیکھ کر حکومتوں نے قیمتوں کے قائم رکھنے کے لئے چاندی کی قانونی و ظاہری قیمت کو اس کی اصلی اور اندرونی قیمت کے مقابلہ میں ایک قانونی تناسب مبادلہ قائم کر کے ابھری ہوئی حالت پر قائم کر دیا تھا -

ہندوستان میں اندرون ملک ... چونکہ کاروبار زیادہ تر حقیر رقوم کے ہوتے ہیں - اس لیے حکومت نے سونے کا سکہ یہاں چلانا مناسب خیال نہیں کیا - اور چونکہ ہندوستان کی بیرونی تجارت بیشتر انگلستان سے یا انگلستان سے گزر کر دوسرے ملکوں سے ہوتی ہے - اس لئے یہاں کی حکومت نے بیرونی مطالبات کی ادائیگی کے لئے یہ مناسب خیال کیا کہ یہاں کا چاندی کا سکہ دیگر سکے، برطانیہ کے سکے سے منسلک کر دیے جائیں - اور ایک قانونی تناسب تبادلہ انیسویں صدی کے اخیر کی چاندی کی قیمت پر نظر کر کے ایک روپیہ = ایک شلنگ چار پنس قائم کر دیا گیا - جنگ سے پہلے پہلے یہ صورت حال کسی کے لئے موجب شکایت نہیں ہوئی - کیونکہ برطانیہ کا ساکھ دنیا میں اسقدر بلند تھا کہ برطانیہ کے سکے اور سونے میں کوئی فرق نہ سمجھا جاتا تھا - لیکن جنگ کے دوران میں جنگ کے بعد سونے اور رائج الوقت کاغذی سکوں میں بعد بڑھتا گیا - اور یہ صورت حال تقریباً تمام ممالک میں رونما ہو گئی - رائج الوقت سکہ آسانی سے سونے میں منتقل نہیں ہو سکتا تھا - اس لئے اب ہندوستان کے سکہ کی قسمت انگلستان کے سکہ کی انقلاب پذیر قسمت سے وابستہ ہو گئی - اور سٹہ کی گرم بازاری ہوئی اور لوگوں نے بلا جائز ضرورت کے روپیہ کو مختلف ملکوں کے سکوں میں بدلنا شروع کیا - گورنمنٹ کے سونے کے اسٹاک جو ولایت میں رہتے تھے خالی ہونے لگے - اس لئے اس نے اپنی اس ذمہ داری سے دست بردار ی کر لی - کہ وہ ایک مقررہ شرح تبادلہ پر تمام روپیوں کے عوض انگلستان کی کرنسی مہیا کرے گی - ایسی صورت میں کوئی مقررہ شرح تبادلہ باقی نہ رہی اور تجارت اور دوسرے اسباب کے مطابق شرح تبادلہ بدلتی رہی - لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ حکومت ہند نے اپنی کرنسی پالیسی کو بھی بدل دیا -

جہاں تک کرنسی کی رسد کا تعلق تھا - اس کو انہوں نے اس طریقہ پر قابو میں رکھا - کہ قیمتوں پر ان کا کوئی اثر نہ پڑ سکے - اور وہ اپنے قدرتی اسباب کی بنا پر متعین ہوں - لیکن بعد میں انگلستان اور دیگر ممالک کی کرنسی پالیسی اور اشیا کی قیمتوں کی حالت کا مطالعہ کر کے اور ان کی اس حالت کو نسبتاً پائدار سمجھ کر گورنمنٹ نے شرح مبادلہ ایک روپیہ = ۲ شلنگ مقرر کر دی - لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ قبل از وقت کیا گیا - اور گورنمنٹ کو نظر ثانی کرنی پڑی - جس کی بنا پر شرح تبادلہ ایک روپیہ = ۱ شلنگ ۶ پنس ہے - لیکن گورنمنٹ پر اب بھی یہی اعتراض ہے کہ فیصلہ میں کوتاہ نظری اور قوم فروشی سے کام لیا گیا ہے اور یہ کہ شرح مبادلہ کو وہی ہونا چاہیئے تھا - جو جنگ سے پیشتر تھی -

ہندوستان کی ایک جماعت یہاں کی سرد بازاری کی بڑی ذمہ داری اسی شرح مبادلہ پر عاید کرتی ہے - اور

کہتی ہے کہ اس کی وجہ سے یہاں کی زراعتی و صنعتی در آمد کرنے والی آبادی کو بیرونی ممالک کے مقابلہ میں ۱۲ ½ فیصدی کم آمدنی ہوتی ہے۔ اور بیرونی ممالک کو یہاں کے مقابلہ میں ۱۲ ½ فیصدی زاید آمدنی ہے۔ اور اسی تناسب سے یہاں کی زراعت، صنعت و تجارت کو دوسرے ممالک کے مقابلہ میں نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور دوسرے ممالک کو ہندوستان کے مقابلہ میں فائدہ ہو رہا ہے۔ اور اس بین الاقوامی تجارتی مقابلہ میں ہندوستان ۱۲ ½ فیصدی کا بوجھ گلے سے لٹکائے ہوئے دوڑ رہا ہے۔ اس کی مزید تشریح اس طرح پر کی جاتی ہے کہ ہندوستان کا ہر کارخانہ دار، مزدوری سود لگان وکرایہ دوکان، محاصل اور اشیاء خام کی قیمت کی ادائیگی میں بمقابلہ غیر ممالک کے ۱۲ ½ فیصدی کا نقصان برداشت کر رہا ہے۔ اور اسی تناسب سے اسے غیر ملکوں میں اپنا مال بیچنے میں نقصان ہے۔ اور غیر ملکوں کو اس کے ملک میں سامان بیچنے میں فائدہ ہے۔ یہ سخت پیچیدہ اور غیر مرئی نقصان و نفع ہے۔ اور ایک غیر ماہر شخص کے لئے اس کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اور جس طرح اس کا اندازہ...... کیا جاتا ہے وہ ایک مستقل مضمون اور اصطلاحی بیان کا محتاج ہے جو فی الحال ملتوی کیا جاتا ہے۔

(۹) حکومتوں پر بھی ایک اور انداز سے موجودہ سرد بازاری کا الزام عاید کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ...... ان کے اخراجات و محاصل میں بہت زیادتی ہو گئی ہے جس کا بوجھ سنبھالنے سے زراعت، اور صنعت و تجارت قاصر ہے۔ جنگ کے زمانہ میں حکومتوں کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔ ان کو پورا کرنے کے لئے حکومتوں کو نئے نئے ٹیکس لگانا پڑے۔ اور لوگوں نے حب الوطنی کے جذبہ میں عارضی ایثار سمجھ کر ان کو برداشت کر لیا۔ علاوہ ازیں سکوں کی زیادتی کی وجہ سے یہ بار کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتا تھا آمدنی سکوں کی شکل میں زیادہ ہوتی تھی اس لئے انھیں سکوں میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ ٹیکس دینا ناگوار نہ تھا۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی۔ اور اخراجات کی زیادتی کا کوئی عذر باقی نہ رہا۔ دوسرے صنعت و زراعت نے اپنی نئی تنظیم شروع کی اور حکومتوں اور بنکوں نے سکوں کی تعداد میں کمی کر کے کرنسی کو قبل از جنگ کی حالت پر لانے کی کوششیں کیں تو گورنمنٹ کے ٹیکس صاف طور پر بہت زیادہ معلوم ہونے لگے۔ حکومتوں نے تخفیف کی کمیٹیاں بٹھائیں لیکن حکومتوں کے اخراجات جنگ کے دوران میں دو طرح سے بڑھے تھے۔ ایک تو وہ جو جنگ کی...... ضرورت کے لئے کرنا پڑے۔ اور دوسرے وہ جنھیں انھوں نے جنگ کی مصیبت کے دوران میں آبادی کے مختلف طبقات مثلاً مزدور پیشہ و دیگر جماعتوں کی دلداری کے لئے برداشت کیا جنگ عظیم کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ہر ملک میں مزدور طبقہ کا اقتدار بڑھ گیا۔ اور حکومتوں کے انتظام میں اس کی بڑی آواز ہو گئی۔ اس لئے حکومتوں کو اس کے منفعت و آرام کے مختلف اسباب فراہم کرنا پڑے۔ مثلاً بے روزگاری کے زمانہ میں وظیفہ، بڑھاپے کی پنشن، مکانات، پارک، اور دیگر حفظ صحت کی تعمیر وغیرہ جیسے اخراجات کی یہ مستقل ہو گئی۔ علاوہ ازیں دوران جنگ میں حکومتوں کو اپنے ملک والوں اور دیگر ممالک

کے افراد اور حکومتوں سے بہت کثیر رقوم کے قرض لینا پڑے جن کے سود اور اصل کی ادائگی بجٹ بنانے والوں کے لیے ایک خاص مسئلہ بن گئی۔ پھر جرمنی اور دیگر مفتوح قوموں سے تاوان جنگ کی امیدنے حکومتوں کو، معاملات کی تلخی محسوس کرنے سے عرصہ تک باز رکھا۔ اور بجٹ بڑی نیک تمناؤں اور نیک ارادوں کے ساتھ بنتے رہے۔ اور وہ آرزوئیں اور تمنائیں اکثر و بیشتر ناکام ثابت ہوتی رہیں۔ اور کہیں حکومتوں کے قرضے بڑھتے رہے اور کہیں ٹیکس۔ اور دونوں صورتوں میں صنعت و تجارت پر اس کا بہت برا اثر ہوا۔ کیونکہ ٹیکس کا بار ملک کی صنعت و تجارت پر ہی پڑتا ہے۔ اور جب گورنمنٹ بازار میں بڑی شرح سود کے ساتھ قرض لینے کے لئے آجاتی ہے تو صنعت و زراعت کو معقول شرح سود پر قرض ملنا دشوار ہوجاتا ہے۔

(۷) اسی سلسلہ کی ایک کڑی جرمنی کے تاوان جنگ کا مسئلہ ہے۔ جب جنگ ختم ہوئی تو جنگ کا الزام مفتوح جرمنی پر عاید کیا گیا۔ اور اُسے ان نقصانات کی تلافی کے لئے جو جنگ سے مختلف قوموں کو برداشت کرنا پڑے تاوان جنگ ادا کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اور چونکہ فرانس کی سرزمین جنگ کا محاذ رہی۔ اس لئے اس تاوان جنگ میں سب سے بڑا حصہ فرانس کو ملا۔ لیکن صورت حال یہ تھی کہ امریکہ کا برطانیہ سب سے زیادہ مقروض تھا۔ برطانیہ کی مقروض فرانس واٹلی وغیرہ تھے۔ اور فرانس کو جرمنی سے سب سے زیادہ تاوان جنگ لینا تھا۔ اس لئے اس بین الاقوامی قرضے کے سلسلے کی آخری کڑی جرمنی تھی۔ اگر جرمنی سے تاوان جنگ وصول ہو تو امریکہ کا قرض ادا ہو۔ اور کل قومیں ایک دوسرے کے قرض کے بارے سبکدوش ہوں۔ تاوان جنگ بہت بڑی مقدار کا عاید کیا گیا تھا۔ اور اس کی ادائیگی اس صدی کے اخیر تک ہر سال ادا ہونا طے پائی تھی۔ اور انتظام یہ کیا گیا تھا کہ تھوڑی رقم سے شروع ہو کے جیسے جیسے جرمنی اپنی صنعت و زراعت کو ترقی دے۔ یہ تاوان بڑھتا جائے اور پھر گھٹنا شروع ہوتے کہ بیسویں صدی کے آخری سالوں میں جرمنی بالکل آزاد ہو جائے۔ جرمن قوم اپنی محنت، مستقل مزاجی اور صبر و ضبط میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اربوں روپیہ کے قرضے کے اس بوجھ کے خیال سے غیر قوم والوں کو تکلیف ہوتی ہے لیکن جس قوم کو اپنی محنت و مزدوری سے اس کو ادا کرنا تھا۔ اس کو تو چاہیئے تھا۔ کہ اپنی قومی ترقی کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتی۔ لیکن نہیں جرمنی کا ہر فرد مستعدی کے ساتھ اس قومی تاوان کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا۔ اور اپنے اخراجات میں انتہائی کمی کر دی۔ اور زیادہ سے زیادہ محاصل جو وہ حکومت کو دے سکتا تھا۔ اس کے دینے کے لئے آمادگی کا اظہار کیا۔ جب غیر قوموں نے جرمنی کے اس عزم و مستعدی کو دیکھا تو انہوں نے جرمنی کو اپنی صنعت و تجارت کے ترقی دینے کے لئے روپیہ قرض دینا شروع کیا۔ اور جرمنی کی صنعت ترقی پانے لگی۔ چند سال تک جرمنی باقاعدگی کے ساتھ تاوان جنگ ادا کرتا رہا۔ گو یہ صحیح ہے کہ جتنا تاوان جنگ وہ ادا کر رہا تھا۔ اسی مقدار میں وہ دوسرے ممالک سے قرض بھی لے رہا تھا۔ اور ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جرمنی کے مدبرین اور سائسین نے

تاوان جنگ کی ادائگی کا یہ ایک اچھا حیلہ نکالا تھا جس سے اس کے ملک کی دولت اس کے ملک ہی میں رہتی تھی۔ اور دوسرے ممالک اس کا تاوان ادا کرتے تھے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ چونکہ اگر یہ واقعی جرمنی مدبرین کی پالیسی تھی۔ تو سخت کوتاہ اندیشی پر مبنی تھی۔ قرض کی ادائگی کے لئے ایک قوم تاوان جنگ سے زیادہ پابند ہے۔ تاوان جنگ معاف ہو سکتا ہے۔ لیکن قرضے کے معاف ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جرمن مدبرین اور سیاسئین اپنے ملک کی صنعت کو ترقی دینا چاہتے تھے۔ اور جنگ میں جسقدر سرمایہ وہ ضایع کر چکے تھے۔ اس کے بعد ان کے پاس سوائے اس کے کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ غیر ممالک سے سرمایہ قرض لیں۔ اور یہ اس وقت تک ناممکن تھا۔ جب تک جرمنی اپنی دیانت و امانت کا ثبوت نہ دیدے۔ چونکہ جرمنی اپنے آپ کو تاوان جنگ کی ادائگی کے لئے پابند کر چکا تھا۔ اس لیے اگر وہ تاوان جنگ ادا نہ کرتا تو بد عہد اور بد معاملہ کہلاتا۔ اور کوئی قوم اسے قرض دینے کے آمادہ نہ ہوتی۔ دوسری پالیسی اس میں یہ تھی کہ جب کسی شخص یا قوم سے قرض لیا جاتا ہے تو اُسے مقروض شخص یا قوم کی خوشحالی سے کم از کم اس حد تک دلچسپی و تعلق ہو جاتا ہے۔ جس حد تک کہ اس کا روپیہ و سود مارا نہ جائے اس اصول پر جرمنی یہ توقع قائم کر سکتا تھا۔ کہ قرضخواہ قوم کے وہ افراد اس کی صنعتی و تجارتی کی ضرور طرفداری کریں گے جنکا روپیہ اس کے ملک میں کاروبار میں پھنسا ہوا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی اسباب ہوں۔ سنہ ۲۹ء تک تو قرض لینے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن سنہ ۳۰ء میں کاروبار کی سرد بازاری دیکھ کر قرض دینے والی قوموں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اب جرمنی کو پہلی دفعہ بلا کسی بیرونی امداد کے تاوان جنگ کی ادائگی کے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ صنعت و تجارت کی سرد بازاری اور بے روزگاری دوسرے ممالک کی طرح جرمنی میں بھی بڑھی ہوئی تھی۔ جرمن قوم کے صبر و ضبط کا پیالہ لبریز تھا۔ اس کے مزدور اور سرمایہ دار جو ممکن قربانی تھی کر چکے تھے۔ اور نئی نسل میں اس الزام کے خلاف کہ جرمنی جنگ عظیم کی ذمہ دار ہے سخت شورش تھی۔ ایک طرف فیسسٹ پارٹی ترقی پاتی جا رہی تھی اور دوسری طرف بالشوک اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی عاجز و تنگ آ کر بالشوزم کی گود میں پناہ لے گا۔ جرمنی کے بالشوک ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ وہ اپنے تمام قرضوں اور تاوانوں سے انکار کر دے گی اور امریکہ اور یورپ بین اقوام کی حکومتوں کے تمام ان حسابات میں فرق آ جائے گا۔ جس کی بنیاد پر ان کے بجٹوں کی ترتیب ہوتی تھی۔ بہت سے بنک فیل ہو جائیں گے۔ اور تمام دنیا میں ...... کھلبلی مچ جائے گی۔ سرمایہ دار اپنے روپیہ کے طلبگار ہوں گے اور جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جائیگا۔ بڑی سرمایہ دار قومیں ایک طرف ہو جائینگی۔ اور دوسری طرف معلوم نہیں کون کون قومیں اس کے علاوہ ...... خود سرمایہ دار ممالک میں جہاں مزدور پیشہ جماعت کا اقتدار بڑھتا جا رہا ہے۔ خانہ جنگی کا احتمال تھا۔ اس اندیشہ کے خیال سے کاروبار میں بے اطمینانی و بیچینی کی کیفیت تھی اور مال کی درآمد و برآمد کی کمی کیوجہ سے ایسی اشیا کی قیمتیں جو برآمد کیجاتی ہیں گری ہوئی تھیں۔ جرمنی دنیا کی پیداوار کی ایک بڑی گاہک ہے۔ اور جب ایک بڑے گاہک کی حالت دوالیہ سے قریب تر ہو تو اسکا اثر تجارت پر پڑنا لازمی ہے۔ (باقی آیندہ) محمد عاقل ایم۔ اے

موسمِ بہار کی ایک رات

سنہ ۱۸۶۱ء کے موسم بہار کی ایک رات ہے، قصر وہائٹ ہال کی سیڑھیوں کا منظر ہے، محل کی گھڑی گیارہ بجاتی ہے۔
شاہی محل کا پہرہ دار ٹہل رہا ہے۔ ایک لبادہ پوش اجنبی محلسرا کے دروازے پر پہونچتا ہے۔

پہرہ دار۔ خبردار، ادب قاعدہ نگہدار! آج کے "الفاظ راز"؟

اجنبی۔ بالکل بھول گیا، پہرہ دار صاحب!

پہرہ دار۔ پھر تم کسی طرح محل میں داخل نہیں ہو سکتے۔ تم کون ہو؟ تمھیں کیا کام ہے؟ بظاہر تو کوئی شریف اور سچے آدمی معلوم ہوتے ہو!

اجنبی۔ بالکل خلاف پہرے دار صاحب! میں دو دن بھی ایک بات پر قائم نہیں رہ سکتا۔ آج انسان ہوں، کل فرشتہ، پرسوں بھوت!

پہرہ دار۔ (ڈرتے ہوئے) بھوت!؟ ——— رحمت کے فرشتے اور حکومت کی محافظ امن جماعت مجھے اس خطرہ سے بچائے۔!!

اجنبی۔ خوب کہا! پہرے دار صاحب سبحان اللہ! ——— تمھاری اجازت سے میں ان الفاظ کو نوٹ بک میں نقل کئے لیتا ہوں۔ میری یادداشت نہایت خراب ہے (نوٹ بک نکال کر لکھنے لگتا ہے)
میرے خیال میں یہ نہایت ہی خوب منظر ہے کہ تم رات کی خاموش اور سنسان فضا میں پہرے پر ٹہل رہے ہو۔ اور میں ایک بھوت کی طرح چاند کی دھندلی روشنی میں تمھارے پاس پہونچتا ہوں . . . . تم تعجب سے مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ . . . . واقعہ یہ ہے کہ میں آج رات ایک نقاب پوش نازنین کے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں پہرہ دار کا نذرانہ دیکر باہر آجاؤں گی، میں نے اُسے اس مصرف کے لئے تھیٹر کے چار ٹکٹ دیدیئے ہیں۔

پہرہ دار۔ خدا اُسے سمجھے، اس نے مجھے صرف دو ٹکٹ دیئے ہیں

اجنبی ۔ (اپنی نوٹ بک کا ایک ورق پھاڑتے ہوئے) لو میرے دوست یہ پرچہ لو۔ جس روز شکسپیر کے کھیل شروع ہوں گے۔ اس روز اس پرچے کے ذریعہ سے تمھیں نہایت اعزاز کے ساتھ خوش آمدید کہا جائے گا۔ تم اپنی بیوی بچوں دوستوں سمیت بلا لحاظ تعداد ان میں شرکت کر سکتے ہو۔ جس قدر جی چاہے آدمی لاؤ، تھیٹر میں کافی جگہ ہے۔

پہرہ دار۔ مجھے ان نئے ڈراموں سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔ کوئی شخص ان کا ایک لفظ تک نہیں سمجھ سکتا۔ نہ گانا ہے۔ نہ ساز ہے۔ شروع سے آخر تک گفتگو ہی گفتگو ہے۔ آپ اپنے تحفہ کو اپنے پاس ہی رکھیے۔ ہاں اگر "ہسپانی خون" کا پاس، آپ مجھے دے سکیں تو آپ کی بڑی عنایت ہو۔

اجنبی ۔ "ہسپانی خون" ـــــ میرے دوست "ہسپانی خون" دیکھنے کے لیے دام خرچ کرنے پڑتے ہیں ...... اس کی ترکیب یہ ہے۔ (وہ اپنی جیب سے ایک سونے کا سکہ نکال کر پہرہ دار کے حوالہ کرتا ہے)

پہرہ دار۔ (نہایت تعجب سے سکہ کو دیکھ کر) خدا آپ کو سلامت رکھے۔ سرکار اُس نقاب پوش نازنین سے کہیں زیادہ فیاض ہیں۔!

اجنبی ۔ میرے دوست عورتیں مردوں کی بہ نسبت کفایت شعار ہوتی ہیں۔

پہرہ دار۔ بے شک آپ نے سچ کہا۔ مرد ہر چیز گراں قیمت پر خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نقاب پوش نازنین کو تو یوں بھی قریب قریب ہر رات پہرہ داروں کو کچھ نہ کچھ نذر کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ خود خیال کیجیے۔ اس صورت میں اگر وہ کفایت شعاری نہ کرے تو کیونکر کام چلے۔

اجنبی ۔ (تعجب و حیرت سے) کیا کہا؟ ـــــ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا۔

پہرہ دار۔ یقین نہ کیجیے، مجھے قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ ضرور عرض کروں گا۔ کہ کم از کم آپ اس قسم کے "عشقیہ کھیل" سال میں دو مرتبہ سے زیادہ کھیلنے کی جرأت نہ کریں۔

اجنبی ۔ بدمعاش کہیں کا........ کیا تو یہ کہنے کی جرات رکھتا ہے کہ میری نقاب پوش نازنین اسی طرح روز چھپ چھپ کر محل سے آتی ہے اور دوسرے آدمیوں سے بھی ملتی رہتی ہے؟

پہرہ دار۔ خدا آپ کی سادگی پر رحم کرے۔ کیا جناب کا اس سے یہ مدعا ہے کہ دنیا میں صرف آپ ہی ایک حسین اور سجیلے نوجوان ہیں؟ اچھا اب آپ جائیے، میں آئندہ اس کا لحاظ رکھوں گا۔ کہ وہ اس فیاض نوجوان کو دھوکا نہ دے جس نے اپنی معصوم محبت کے لئے مجھے زندگی میں سب سے پہلے سونے کا سکہ دیا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں۔

اجنبی ۔ پہرہ دار! کتنی حیرت انگیز بات ہے؟ ہم سب اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ کہ دنیا کی تمام عورتیں فریب کار،

دغاباز اور حیلہ ساز ہوتی ہیں، سب کو اس بات کا یقین ہے، لیکن جب ہم اپنی محبوبہ میں اس صفت کو پاتے ہیں۔ اور کوئی اتفاق ہماری آنکھیں کھولتا ہے۔ تو ہمیں ایسا تعجب ہوتا ہے گویا کوئی نہایت ہی غیر ممکن بات تجربہ میں آرہی ہے۔ اکثر ہم خود کو جھٹلانے لگتے ہیں اور بیشتر اپنی ہی آنکھوں کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہرہ دار۔ سب کے لئے آپ ایسا نہیں کہہ سکتے، جناب اکثران میں نیک بھی ہوتی ہیں۔

اجنبی۔ (اظہار برہمی کے ساتھ) ہرگز نہیں، کوئی نہیں، سب کی سب دغاباز ہوتی ہیں۔ اور تمام کی فطرت میں قدرت نے فریب تخلیق کیا ہے۔ اگر تمھیں اس سے انکار ہے تو یقیناً تم خود کو فریب دے رہے ہو۔

پہرہ دار۔ معاف کیجئے آپ نے زیادہ تر کلسرا کی عورتوں کے تجربہ پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ یہاں کے متعلق بے شک آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں فریب کا دوسرا نام عورت ہے۔

اجنبی۔ (نوٹ بک نکالتے ہوئے) جزاک اللہ، اپنے الفاظ کو پھر دُہرانا ——— وہی الفاظ جو تم نے عورت کے لئے استعمال کئے ہیں ——— ہاں وہی روح پرور راگ!

پہرہ دار۔ کون سا راگ جناب ——— خدا کی قسم میں بالکل گانا نہیں جانتا!

اجنبی۔ گانا تمھارے خمیر میں موجود ہے، راگ تمھاری فطرت ہے۔ تمھاری گفتگو سے اس کا اظہار ہو رہا ہے . . . . ہاں (لکھتا ہے)

——— "فریب تیرا نام عورت ہے" . . . . (جھوم کر دُہراتا ہے) "فریب تیرا نام عورت ہے!" ——— آہ!!

پہرہ دار۔ جناب مجھے حیرت ہے کہ ان چار لفظوں میں کیا ہے۔ جس پر آپ جھوم رہے ہیں؟ کیا آپ "گدائے الفاظ" ہیں۔

اجنبی۔ "گدائے الفاظ"! . . . . (تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر) غیر فانی ——— مُطلق غیر فانی اصطلاح ہے!! (لکھتے ہوئے منہ ہی منہ میں) یہ پہرہ دار مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہے!

پہرہ دار۔ معلوم ہو گیا۔ آپ بھی ہمارے درباری شاعر کی طرح مدہوش رند ہیں۔

اجنبی۔ کیوں؟ ——— میں اسے جانتا ہوں وہ میرا عزیز دوست ہے، اس کی مدہوشی سے تمھارا کس طرف اشارہ ہے۔؟

پہرہ دار۔ چاندنی رات میں غزلیں ——— اور اسی نقاب پوش نازنین کے لئے لکھنا جس کے لئے آپ نے زحمت گوارا فرمائی ہے ———!

اجنبی۔ اچھا؟ . . . . . . کیا صورت حال یہ ہے؟ اور میں اُسے اپنا دوست سمجھتا ہوں!!

پہرہ دار ۔ ایسا ہی ہوتا ہے!
اجنبی ۔ اور شاید ایسا ہی ہوتا آیا ہے ——— (غصہ سے) شیطان کی صورت میں دوست! خدا کی پناہ!!
پہرہ دار ۔ کیا واقعی ہمارا شاعر اسی قابل ہے جیسا آپ فرماتے ہیں؟
اجنبی ۔ (اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کسی حقیقت کو سمجھ کر) کسی قابل؟ . . . . نہیں میاں پہرہ دار ——— یہ انسانیت سے بعید ہے، واقعہ یہ ہے کہ جب ہم غصہ میں ہوتے ہیں اور آپس میں کوئی وجہ شکایت ہوتی ہے، تو ہم سمجھ دار انسان بھی اکثر ایک دوسرے کو بلا سوچے بچوں کی طرح گالیاں دینے لگتے ہیں ۔ یہ انسان کی فطرت ہے . . . . صرف اتنی سی بات ہے ۔
پہرہ دار ۔ محض الفاظ کی لوٹ پھیر ہے ۔ صرف الفاظ کی، لیکن افسوس! یہ الفاظ ہوائی قلعے ہیں ——— محض ہوا ۔ آپ بھی جانتے ہوں گے کہ ہوا سے ہمارے پیٹ نہیں بھر سکتے ۔
اجنبی ۔ کیا خوب تنقید ہے! . . . . . . اجازت ہے (یہ کہکر وہ اپنی نوٹ بک میں لکھنے لگتا ہے)
پہرہ دار ۔ اور یہ تنقید کیا بلا ہوتی ہے؟ . . . . . . میں نے اپنی زندگی میں اس لفظ کو نہیں سنا ۔
اجنبی ۔ (مسکراتے ہوئے) بنی تلی بات کہنا، بے لاگ محاکمہ کرنا تنقید کہلاتا ہے ۔
پہرہ دار ۔ آپ کی گفتگو بھی عجیب ہے ۔ معاف کیجئے، میری سمجھ میں تو آتی نہیں ۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ آپ نہایت ہی با اخلاق آدمی معلوم ہوتے ہیں، آپ کے الفاظ میں ایک غریب آدمی کو اپنی طرف کھینچنے کی کشش موجود ہے اور جب آپ گفتگو کرتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے گویا آپ کے دل میں اُس کے خیالات و جذبات کے ساتھ پوری ہمدردی موجود ہے ۔
اجنبی ۔ میری زندگی کا مقصد ہی یہ ہے ۔ لیکن افسوس زمانہ میرے ساتھ نہیں ہے ۔ دنیا میرے جذبات کا احترام کرنے کے لئے ابھی تیار نہیں . . . . (محلسرا کا دروازہ اندر سے کھلتا ہے اور روشنی کی شعاعیں اگلی سیڑھیوں پر پھیل جاتی ہیں ۔)
پہرہ دار ۔ وہ لیجئے آپ کی محبوبہ آگئیں، اب میں گشت کے لئے دوسری طرف جاتا ہوں ۔ آپ اپنے کام سے لگئے ۔ میں اپنا کام دیکھتا ہوں ۔ جس وقت تک میرا محافظ نہیں آتا اس وقت تک بظاہر میری واپسی کی بھی کوئی اُمید نہیں ۔ محافظ سست آدمی تو ضرور ہے لیکن اتنا ہی سخت بھی ہے ۔ اس سے ذرا ہوشیار رہئے ۔ اچھا شب بخیر! . . . . . . (مسکراتے ہوئے) اور بھی سب کچھ بخیر! (چلا جاتا ہے)
اجنبی ۔ سست بھی ہے اور سخت بھی (دل ہی دل میں) "سخت سست کہنا" تو محاورہ تھا ۔ لیکن اس پہرے دار نے محاورات کی لغت میں آج ایک نیا اضافہ کیا ہے ۔ واہ! (نوٹ بک میں لکھ لیتا ہے)

(ایک لبادہ پوش عورت اٹھلاتی ہوئی محل سے نکلتی ہے، اور ایک بہکے ہوئے سے انداز میں سیڑھیوں سے اتر کر بائیں باغ میں ٹہلنے لگتی ہے۔ اُس کے انداز سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ وہ نیند میں اٹھ کر چلی آئی ہے۔ اور خواب ہی میں ٹہل رہی ہے۔)

نازنین۔ (اپنے دونوں ہاتھوں کو اس طرح ملتے ہوئے گویا انھیں صابن سے دھو رہی ہے) چھوٹ، ناپاک نشان چھوٹ، اب بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ ابٹن نے اسے اور نمایاں کر دیا ہے۔ مگر .... خدا نے تیرا رنگ روپ کچھ اور بنایا ہے اور تو اُسے کچھ اور بنانا چاہتی ہے .... عورت!! نادان مخلوق ——— ! ابھی بہی قبر کا بھی خیال کر لیا کر، ہمیشہ خوبصورتی کے خیال میں الجھے رہنا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ وادیٔ کشمیر کی تمام خوشبوئیں اور سرزمین شام کے جملہ معطر ابٹن بھی مل کر اس داغدار ہاتھ کو خوبصورت نہیں بنا سکتے ...."

اجنبی۔ "وادیٔ کشمیر کی تمام خوشبوئیں" .... کیسی حسین اور نازک بات ہے! کتنا پیارا خیال ——— ایک نظم کا مکمل عنوان! اور ایک عنوان میں مکمل نظم!! ——— کیا یہ میری پیاری "میری" ہے۔ (نازنین سے) تم ایسی نامانوس اور اجنبی آواز میں کیوں بول رہی ہو؟ اور سلام دعا سے قبل اس شاعری کا کیا موقعہ ہے، میری! تمھارے دل کو کوئی درد تو نہیں پہونچا؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ (زیر لب) خداوندا یہ مردوں کی طرح کیوں ٹہل رہی ہے؟ (ذرا اونچی آواز سے کان کے قریب منھ لے جا کر) "میری! ——— پیاری میری"!!

نازنین۔ (اسی کے الفاظ باز گشت کرتے ہوئے) "میری!" ——— "میری!!" ——— کسے خیال تھا کہ اس عورت میں اتنا خون ہوگا؟ کیا یہ بھی میرا قصور ہے کہ میرے مشیر کار ہی اب اس کے خون کا الزام میرے سر تھوپ رہے ہیں۔ خدا کی پناہ! .... میری اگر تو عورت تھی تو بہ نسبت خون کے تجھ میں چالاکی اور ذہانت زیادہ ہونی چاہیے تھی۔ یہ کیا کہ تمام فرش کو بے تمیزی سے خون آلود کر دیا .... دیکھو اس کا سر اس طرح مت اٹھاؤ، یہ قول فراموش ہے، جھوٹی ہے! .... کہہ تو رہی ہوں کہ میری مر چکی ہے، اُسے دفن بھی کر دیا گیا، وہ قبر سے باہر نہیں آسکتی .... مجھے اب کوئی خطرہ نہیں۔ ——— یہ بلیاں ——— عورت کی صورت میں طمع کی بلیاں، جنکے لیے ایک مرد کی آغوش سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی، تخت شاہی پر چھلانگ مارنے کی جرأت کرتی ہیں، ایسی گستاخ جرأتوں کی سزا سوائے گردن مارنے کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اب جو ہو گیا وہ ہو چکا، اور جو ہو چکا وہی ٹھیک تھا ... چھوٹ ناپاک نشان چھوٹ .... واہ! ملکہ اور داغوں کے نشان ——— ! واہ!"

اجنبی - (نازنین کا شانہ ہلاتے ہوئے) "میری "———سنو تو! کیا سو رہی ہو؟

(نازنین جاگتی ہے، گھبرا کر چونکتی ہے اور پھر اس پر ایک غشی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اجنبی اُسے اپنی آغوش میں سنبھال لیتا ہے)

نازنین - (کچھ دیر بعد چونک کر) میں کہاں ہوں؟ . . . . . . تو، کون ہے؟

اجنبی - (گھبرا کر) معزز خاتون مجھے معاف کرنا ابتک بڑا مغالطہ رہا، میں تمھیں اپنی محبوبہ میری سمجھ رہا تھا۔

نازنین - (برہمی سے الگ ہٹ کر) شریر انسان! تجھے یہ جرأت کیسے ہوئی؟

اجنبی - ناراض نہو، معزز خاتون، میری محبوبہ بھی نہایت حسین ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ تمھاری طرح شُستہ اور فصیح گفتگو نہیں کر سکتی . . . . آہ! "وادیٔ کشمیر کی تمام خوشبوئیں . . . . . ."

یہ تم نے خوب کہا اور نہایت ہی دلکش انداز میں کہا۔

نازنین - تو کیا میں یہاں تم سے گفتگو بھی کر چکی ہوں؟

اجنبی - ہاں! حسین خاتون، کیا تم اتنی جلد بھول گئیں؟

نازنین - میں خواب کی حالت میں تھی۔

اجنبی - حسین خاتون! خدا کرے تم ہمیشہ اسی طرح خواب دیکھتی رہو، اس لئے کہ اس حالت میں جو الفاظ تمھاری زبان سے نکلتے ہیں وہ شہد سے زیادہ شیریں اور نغمہ سے زیادہ مترنم ہوتے ہیں!

نازنین - (ایک شاہانہ انداز سے) تمھاری گفتگو کسقدر بیباک ہے؟———تمھیں معلوم ہے۔ کہ تم کس سے مخاطب ہو؟!

اجنبی - (لاپروائی سے) مجھے معلوم نہیں، نہ معلوم کرنے کی ضرورت———میرے خیال میں تم شاہی باغ کی کوئی تتلی ہو، جن کی دو قسمیں ہیں———ایک وہ جو اپنے نرم و نازک لہجے سے فضا کو مترنم بنائے رکھتی ہیں، اور دوسری وہ جو خاموشی سے خود کو پھولوں کی آغوش میں دے دیتی ہیں۔ تمھاری آواز میں ایک قدرتی نغمہ اور ایک فطری کشش موجود ہے۔ . . . . . . اس طرح نہ دیکھو! میں رشک نہیں کر رہا ہوں، نہ مجھ میں اس کی جرأت!"

نازنین - تم میں کس قدر جسارت ہے؟ میں حیران ہوں! خیر، آپ کی توصیف و ثنا حد سے تجاوز کر چکی ہے۔ اب براہ کرم اس قصیدے سے گریز کیجئے . . . .

اجنبی - (گفتگو روکنے کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے) "قصیدے سے گریز کیجئے!"

نازنین - گستاخ اجنبی! کیا تو میرے روبرو میری نقل اتار رہا ہے؟ اتنی جرأت؟!

اجنبی - یہ نغمہ ہے! اس کا نام راگ ہے۔ کیا تمھیں علم نہیں کہ جب کوئی اچھا مغنی کوئی نئی چیز گاتا ہے تو ہم بلا ارادہ اُسے چپکے چپکے دُہرانے لگتے ہیں تاکہ اس کے لہجے اور اس کی دُھن کا چربہ ہمارے گلے میں اتر آئے۔ کسی راگ کو مع اتار چڑھاؤ کے ہم اسی طرح سیکھتے ہیں اور صرف یہی اس کے سیکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ . .

. . . . . . "قصیدے" کے ساتھ "گریز" کا لفظ کسی زبردست شاعر ہی کی زبان سے ادا ہو سکتا تھا۔ لیکن تم نے جس شیرینی سے اُسے ادا کیا ہے۔ وہ شاعر کی زبان میں کہاں؟ ——

قصیدے کے ایک لفظ میں ان تمام جذبات کی دنیا آباد ہے جو مرد عورت کی طرف سے اپنے دل میں پرورش کرتا رہتا ہے اور گریز کی ایک اصطلاح میں ان جملہ خصوصیات نسوانی، اس تمام "استغنائے حسن" کی تصویر ہے جو عورت مرد کے لئے اپنے اندر پیدا کرتی ہے۔! . . . . ہاں کیا کہا تھا تم نے خاتون . . . . . . ابھی قصیدہ گوئی میں . . . .

نازنین - عجب پراگندہ دماغ ہے! میں نے کہا اور اب پھر کہتی ہوں کہ اس قصیدے سے گریز کیجئے۔

اجنبی - (جلدی سے) آہا ہا —— "قصیدے سے گریز کیجئے" —— "قصیدے سے گریز" —— "قصیدے سے . . . ."

لعنت میری یادداشت پر! بلا لکھے کام نہ چلے گا۔ (لکھنا شروع کرتا ہے مگر پھر بھول جاتا ہے) . . .

ہاں اے "ملکۂ شعر" میرے پراگندہ دماغ سے تمھیں کیا شکوہ تھا؟ تم نے بالکل صحیح کہا، خود میری سماعت نے محسوس کیا کہ میں غلط دہرا رہا ہوں۔

نازنین - تم نے "قصیدہ گوئی" کی میں نے کہا "قصیدہ سے گریز کیجئے"۔

اجنبی - (کاٹ کر صحیح لکھتے ہوئے) جزاک اللہ! . . . . . . اچھا چونکہ تمھارا حکم ہے کہ یہ قصیدے کا موقعہ نہیں ہے، اس لئے میرے خیال میں "گریز" کی بھی ضرورت نہیں۔ لو بس اب تم صرف میری ہو جاؤ، میری ملکۂ شعر!

نازنین - بڑھ چلا، نفس کا غلام بڑھ چلا، (خود ہی، زیر لب) خیر آج یہ تماشہ بھی سہی۔ (اجنبی سے مخاطب ہو کر) "کیا یہ ایک اتفاق ہے کہ آپ کے دریائے محبت میں سیلاب آگیا ہے یا عادت سے مجبور ہو کر آپ ایسا کر رہے ہیں؟

اجنبی - نہیں۔ محبت نہ اتفاق کا نام ہے نہ کوئی عادتاً اسے اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی ذمہ دار خود تمھاری ذات ہے۔ تم نے ہی میرے دل میں محبت پیدا کی اور اب میں اسے اپنے جذبات کا جامہ پہنا کر تمھارے ہی قدموں پر نثار کر رہا ہوں۔ اس لئے اب یہ سوال بعد از وقت ہے کہ مجھے محبت کی عادت ہے یا یہ اتفاق

ہے - میری روح کی مالکہ میرے خیال کی ملکہ!! میں اب تیرا ہوں . . . . نہیں، یہ الفاظ میں اس سے قبل بھی کہہ چکا ہوں، اب میری محبّت کے لفظی لباس کو زیادہ آتش ساماں ہونے کی ضرورت ہے . . . . ''

نازنین - تم بہت طویل گفتگو کرتے ہو، تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں کسی کا طول طویل لیکچر سننے کی عادی نہیں ہوں، بلکہ میرے کان اپنی آواز اور اپنے احکامات سننے کے زیادہ عادی ہیں -

اجنبی - تمھیں پر کیا منحصر ہے - وہ سب جن کی گفتگو شیریں ہوتی ہے، اسی طرح اپنی گفتار پر ناز کیا کرتے ہیں - بلاشبہ تمھاری زبان ستاروں کی زبان اور تمھارے نغمے فرشتوں کے گیت ہیں! . . . . . مگر تمھیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں "الفاظ کا بادشاہ" کہلاتا ہوں! . . . .

نازنین - بادشاہ! ہا ہا ہا! . . . .

اجنبی - بیشک، بادشاہ سے کسی طرح کم نہیں، ہر چند کہ ہم ایک ادنیٰ مخلوق ہیں، ہم مرد و عورت!

نازنین - عورت!؟ ایں؟ کیا تو مجھے صرف "عورت" کے لفظ سے مخاطب کر رہا ہے!

اجنبی - اس سے زیادہ حسین اور موزوں خطاب تمھارے لیے کیا ہو سکتا ہے؟ تمھیں بتلاؤ اور کس خطاب سے میں تمھیں رام کر سکتا ہوں . . . . وہ اور کونسا نام ہے جسے محبت محبوب کیلئے تجویز کرتی ہے ——— تمھاری برہمی بھی ایک حد تک درست ہے، جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ہم محض ایک ادنیٰ مخلوق ہیں، لیکن پھر بھی ایک جوہر ہمارے اندر پوشیدہ ہے جو اگر کسی طرح جلا پا جائے تو ہمیں فرشتوں سے بہتر بنا سکتا ہے

نازنین - ختم کیجئے! اس حکیمانہ وعظ کو ختم کیجئے!! میں خود اپنے کو بہتر سمجھتی ہوں -

اجنبی - یہ حکیمانہ وعظ نہیں بلکہ ناقابل انکار حقیقت ہے، وہ "جوہر" جس کا میں نے تذکرہ کیا ہمارا نفس شاعر ہے - جوہر فانی نہیں ہوتا - دنیا یقیناً ایک فریب فانی ہے - اور ہماری حقیقت حقیر حشرات الارض سے زیادہ نہیں مگر صرف نفس شاعر کو بیدار کرنے اور محبت کا سحر آفریں جامہ پہنانے سے ہم اپنی روح کو غیر فانی حقیقت میں تبدیل کر سکتے ہیں، اس حد تک کہ تمام کائنات "حقیقت عریاں" بن کر شگفتہ ہو جائے اور اپنے دامن میں صدہا فردوس ہمارے لئے مہیا کر دے -

نازنین - تم اپنے دریائے فصاحت میں اپنی فردوس کو بہائے دے رہے ہو - بہت ناعاقبت اندیش ہو - مبالغہ کی کوئی حد بھی ہونی چاہیے -

اجنبی - اس وقت تمھاری تنقید میں یاس کا رنگ ہے -

نازنین ۔ کون سیناس ؟ . . . . . . یہ کون صاحب ہیں ؟

اجنبی ۔ ایک خشت انداز، ایک ناسمجھ معمار ! جو یہ خیال کرتا ہے کہ آسمان وہیں ہے ۔ جہاں تک اس کی سیڑھی کی رسائی ہے، اور محض اس کی بنا پر میری بلند پردازی کو مبالغہ سمجھتا ہے ۔ تم باور کرو !

پیاری تتلی ! دنیا میں ابھی تک کوئی لفظ ایسا اختراع نہیں ہو سکا ہے اور کوئی راگ ایسا نہیں گایا جا سکا ہے جو مبالغہ تو درکنار اس حقیقت کی ادنیٰ سے ادنیٰ ترین ترجمانی بھی کر سکے جو محبت کا احساس قلب میں پیدا کر دیتا ہے ۔ اس سے انکار کرنا واقعات کو جھٹلانا ہے ——— ! کیا تمہیں علم نہیں کہ ابتدائے آفرینش بھی صرف ایک ہی لفظ کی رہین منت ہے، اور وہ لفظ خدا کے ساتھ وابستہ تھا ——— نہیں بلکہ وہی لفظ خدا تھا ——— !

نازنین ۔ خبردار ! اجنبی انسان، ذرا سوچ سمجھ کر ! مذہب کے متعلق اسقدر بیباکی سے گفتگو ! کیا تو نہیں جانتا کہ ملکہ مذہب کی محافظ اور علمبردار ہے ! ؟

اجنبی ۔ اور میرے نزدیک ملکہ تم ہو، اس لئے تم ہی مذہب کی علمبردار ہو، ابھی کیا، جب ابتدا میں تم نے "وادیٔ کشمیر" والا نغمہ چھیڑا ہے، اسی وقت میں نے تمہیں اپنے مذہب محبت کا علمبردار بنایا تھا ۔ مگر کیا ملکۂ انگلستان بھی ان الفاظ کو کہہ سکتی ہے ؟ میں نے تو یہ سنا ہے کہ اس کے راگ صرف گرجا کی کنواریوں کے لئے مخصوص ہیں، اگر یہ درست ہے تو آج بجائے اُن کے میں اس عزت کا مستحق ہوں، میں تمہاری دست بوسی کر کے اظہار عقیدت کروں گا لیکن جب تک مقدس راگ کے شروع ہونے کا وقت آئے تب تک تم میرے "دل کی ملکہ" ہو ——— میں ان لبوں کو بوسہ دوں گا جنھوں نے میری روح پر نغموں کی بارش کی ہے . . . . (یہ کہکر وہ نازنین کو اپنی آغوش میں کھینچ لیتا ہے)

نازنین ۔ (آغوش میں تڑپتے ہوئے) حد سے زیادہ گستاخی ! . . . . . . اپنی زندگی عزیز ہے تو فوراً میرے جسم سے ہاتھ ہٹا ۔ ! . . . . فوراً !

(ایک نقاب پوش نازنین چکور کی طرح دبلی ہوئی تیزی سے محل سرا کی سیڑھیوں سے اترتی ہے اور چپکے سے دونوں کے پیچھے آکر چھپ جاتی ہے ۔ ان کی گفتگو سنکر بپھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹتی ہے مگر پھر ٹھٹکتا ایک طرف سایہ میں چھپ رہتی ہے ۔)

اجنبی ۔ (نقاب پوش نازنین سے بے خبر) اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو میرے ہاتھوں میں جو ایک نئی زندگی کی رو دم دوڑا رہی ہو اُسے روک دو ۔ تم تو خود ہی مجھے کہربا کی طرح کھینچ رہی ہو ۔ تمہاری آغوش سے وابستہ رہنے

میں میرے ارادے کو مطلق دخل نہیں ہے اور اب جبکہ ہم جذب وکشش سے لذت آشنا ہو چکے ہیں۔
ہماری ہستی علیحدہ نہیں کی جا سکتی، ہم دونوں ایک ہیں، کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی - !

نقاب پوش نازنین - اس دعوے کے ثبوت کی ضرورت ہے، دغا باز اور فریبی حیوان! لے یہ تیرے اور تیری کتیا کے عہد و پیماں پر ایک مہر توثیق . . . .

(ان الفاظ کے ساتھ وہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر پوری قوت سے دونوں
کے دو ہتڑ مارتی ہے، اور وہ چونک کر علیحدہ ہو جاتے ہیں)

پہلی نازنین - (غیظ و غضب سے سُرخ ہو کر، لبادہ اتار کر پھینکتے ہوئے) حملہ آور نازنین سے) ——— انتہائی نمک حرامی !!!

نقاب پوش - (پہچان کر، خوف سے لرزتے ہوئے نازنین کے قدموں پر گر کر) آہ تقدیر! میں کہیں کی نہ رہی اب کون بچا سکتا ہے؟ میں نے ملکۂ عالم کے ساتھ گستاخی کی ہے !!!

اجنبی - (ایک فخریہ انداز سے تنکر) نہ صرف اسقدر بلکہ " ولیم شیکسپیئر " کے ساتھ بھی گستاخی کی ہے!!!!

ملکۂ الزبتھ - (ادب سے گردن جھکا کر) میری! بڑا ستم ہو گیا تو نے ولیم شیکسپیئر کی خدمت میں گستاخی کر دی!!! انتہا ہو گئی!! مگر تجھے اُن تمام بدمست ہرنیوں، ان سب محبت کی بھوکی کنواریوں، اور ان جملہ اندھیرے میں اُڑنے والی عصمت فروش چمگادڑوں کی قسم جنہوں نے میرے محل کی فضا کو گناہوں سے آلودہ کر رکھا ہے، مجھے اتنا بتا دے، صرف اتنا کہ یہ حضرت ولیم شیکسپیئر صاحب دام اقبالہٗ کون ہیں؟ اور کس سرزمین کے بادشاہ ہیں؟ !

نقاب پوش - صرف ایک ایکٹر، ملکۂ عالم! . . . . آہ! خدا میرا ہاتھ اٹھنے سے پہلے ہی کیوں نہ کاٹ دیا -

ملکہ الزبتھ - اگر تیری یہی تمنا ہے تو اس کا پورا ہونا کچھ مشکل نہیں، لیکن یہ اور زیادہ آسان ہے - کہ ہاتھ ہی کے ساتھ تیرا سر بھی قلم کرا دیا جائے -

نقاب پوش - ولیم! . . . . بچالے! خدا کے لئے مجھے بچالے !!!

الزبتھ - بچالے، اور یہ !! واقعی یہ اسی قابل ہے کہ تجھے بچالے گا!
میرا قیاس تھا کہ یہ شخص کم از کم کوئی خاندانی رئیس یا سردار ضرور ہوگا، اس لئے کہ مجھے اپنے محل کی ادنےٰ ترین خادمہ کے متعلق بھی یہ گمان نہیں تھا کہ وہ کسی حقیر خاندان کے آدمی سے مل کر وقارِ شاہی کی ذلت کرے گی -

شیکسپیئر - (برہمی سے زمین پر قدم مار کر) حقیر خاندان!! . . . . کیا کہا؟ . . . . میں شیکسپیئر آف اسٹریٹ فورڈ! ——— میں! جس کی ماں آرڈا نی نسل کا چشم و چراغ تھی - اور حقیر خاندان ——— ملکہ شاید بہک رہی ہے، یا خود فراموشی کے عالم میں ہے!!!

الزبتھ - اتنی جسارت! . . . . ذلیل انسان ——— ! بیشک میں نے تجھے حقیر کہا - اور تجھے بتائے دیتی ہوں . . . . ،،

نقاب پوش - (الزبتھ کے قدموں سے اٹھ کر خود کو دونوں کے درمیان ڈالتے ہوئے) ولیم! خدا کے لئے، ملکہ کو زیادہ برہم نہ کرو، اسے غصہ دلانا موت کے مترادف ہے - (ملکہ سے مخاطب ہو کر) اس کی باتوں پر نہ جائیے!

شیکسپیئر - میری تم اپنی زندگی کے متعلق استدعا کر سکتی ہو، میرے لئے کچھ نہ کہو، میری نظر میں اس ملکہ کی کوئی وقعت نہیں ہے - جو میرے خاندانی اعزاز سے غافل ہے . . . . . . مجھے اس سے انکار نہیں کہ میرا باپ نہایت غریب آدمی تھا، لیکن یہ بھی اس وجہ سے ہوا کہ اس کا شریف خون اسے دوسرے غریبوں کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کرنے پر مجبور کرتا تھا - اس نے مرتے دم تک اپنے قرضوں سے انکار نہیں کیا - اب یہ اور بات ہے کہ اسے اپنی زندگی میں ادائیگی کی استطاعت نہ ہو سکی - تاہم اس کی نیک نیتی اسی سے ظاہر ہے کہ اس نے مرتے دم اپنے قرضخواہوں کی ایک ایک پائی تسلیم کر کے دستاویزات پر دستخط کئے جنکی بدولت بعد میں ادائیگی ہوئی ورنہ ہم کسی کا ایک ادا کرنے کے ذمہ دار نہ تھے -

الزبتھ - (طنز سے) تمھارے اوچھے باپ کا بیٹا اب شہنشاہ ہنری ہشتم کی لڑکی سے اپنا جائز انعام پائے گا -

شیکسپیئر - (غیر معمولی افتخار سے تنکر) اُس وحشی انسان کا نام اسٹریٹ فورڈ کے عالی خاندان بزرگ کے ساتھ نہ لو - جان شیکسپیئر (میرے باپ) نے شریف عیسائیوں کی طرح صرف وہی ایک شادی کی جس کی مذہب نے اجازت دی ہے - ہنری ہشتم نے چھ عورتوں سے شادی کی! تمھیں اس کا نام لیتے ہوئے شرم آنی چاہیئے!

نقاب پوش ——— } دونوں ساتھ ساتھ چلاتے ہوئے ← ولیم خدا کے لئے!!!
الزبتھ - } ← گستاخ کتا!!!

شیکسپیئر - (دونوں کی گفتگو قطع کرتے ہوئے) اچھا! تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ ہنری ہی حقیقتاً تمھارا باپ تھا ———؟!!

الزبتھ ۔ ـــــ باجی ! (غصہ سے دانت پیسنے لگتی ہے)
نقاب پوش } (دونوں ساتھ ساتھ) ـــــ خداوندا ! . . . . میں کیا دیکھ رہی ہوں . . . . . مجھے بازاروں میں کوڑے لگائے جائیں گے . . . . آہ موت ! ایسی شرمناک موت ! میرے اللہ ! !

شیکسپیر ۔ خاتون ! اپنی اصلیت کو ذرا اور تحقیق کرکے معلوم کرو ۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے ؟ میں تو اپنے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں خود شریف ہوں اور شریف و ایماندار والدین کی اولاد ہوں ۔ میں نے حال ہی میں "خلعت فاخرہ" کے لئے حکومت پر اپنا حق ظاہر کیا ہے اور درخواست بھی بھیجدی ہے ۔ قانوناً میں اوس کا مستحق ہوں ، وہ مجھے ملنی چاہیئے اور یقیناً ملے گی ۔ کیا تم بھی اسی فخر اور یقین کے ساتھ اپنے متعلق کچھ کہہ سکتی ہو ؟

الزبتھ ۔ (غصے سے بیتاب ہوکر) خاموش گستاخ ! خبردار ! دوسرے لفظ کے ساتھ مجھے خود اپنے شاہی ہاتھوں سے وہ کام شروع کرنا پڑے گا جسے جلاد ختم کرے گا ـــــ !

شکسپیر ۔ (اطمینان کے ساتھ) تمہاری رگوں میں ایک سچے ٹیوڈر خاندان کا خون نہیں معلوم ہوتا (نقاب پوش کی طرف اشارہ کرکے) یہ گمناموں کی ناکارہ پوش بھی تخت شاہی کو ویسی ہی زینت دے سکتی تھی ۔ جیسی تم ۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جو انگلستان کے تخت پر تمھیں متمکن کئے ہوئے ہے ۔ اور وہ کون سی چیز ہے جس نے دنیائے عیسائیت کے لبوں پر مہریں لگا رکھی ہیں ـــــ تمھاری مشہور ذہانت ، یا دانشمندی ؟ !

میرے خیال میں تو دونوں میں سے ایک بھی بات تم میں نہیں ہے ۔ یہ محض ایک اتفاق ہے ۔ جو ایک گوالن کے لئے بھی اسی طرح ممکن تھا جس طرح تمھارے لئے ۔ ہاں ایک خصوصیت ضرور ہے ۔ فطرت نے تمھیں حسین بنایا ہے ، اور ایک دلکش آواز عطا کی ہے ۔ ایسی آواز جو عورت سے بلا سلطنت بھی حکومت کرا سکتی ہے ! . . . .

(الزبتھ مارنے کے لئے ہاتھ بلند کرتی ہے جو یکایک کسی خیال کے ماتحت گر جاتا ہے ۔ شکسپیر بدستور اپنی تقریر جاری رکھتا ہے)

. . . . خالباً یہی صفت ہے جس نے تمام انسانوں کی جگہ تمھارے قدموں میں تجویز کی ہے اور تمھارا تخت تمھارے مغرور و متکبر قلب کی اس ناقابل تسخیر چٹان پر قائم کیا ہے ۔ جو جذبات کے سمندر میں ایک سنگین جزیرے کی مانند ہے . . . . آہ !

قدرت بھی کتنی دشوار پسند ہے ۔ ؟ ! . . . . . . ان ناتراشیدہ مگر سیدھے سچے الفاظ میں تمھارا صحیح مرقع

بالکل فطری حالت میں میں نے پیش کر دیا ہے .... اب میں حاضر ہوں جو انتہائی سزا میرے لئے تجویز ہو!

الزبتھ - (شاہانہ وقار سے) ماسٹر شکسپیر! یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ میں ایک رحمدل اور خدا ترس شہزادی ہوں، یقین کرو کہ تمھاری عدم واقفیت اور جاہلانہ طرز گفتگو ہی مجھے بجائے سختی کرنے کے ہنسنے پر مجبور کر رہی ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ بہت سی باتیں ہیں جو بظاہر صحیح ہوتی ہیں مگر انھیں زبان پر لانا گناہ ہوتا ہے (میرا مدعا یہ نہیں کہ صرف ملکہ کے حضور میں اس کا لحاظ ضروری ہے، اس لیے کہ تم مجھے ملکہ ہونے کا تو اہل ہی نہیں سمجھتے) بلکہ ایک دوشیزہ کے وقار عصمت کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ہر شریف آدمی کا فرض ہے کہ سوچ سمجھ کر بات کہے۔

شکسپیر (اسی لاپروائی کے انداز سے) آپ کا دوشیزہ رہنا میرا قصور نہیں ہے، ہاں میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھ سکتا ہوں!!

نقاب پوش - (پھر خوف سے لرز کر) رحم! ملکۂ عالم رحم!! اس کے ساتھ زیادہ گفتگو نہ کیجئے۔ اس کی زبان اسی قسم کے گستاخانہ مذاق کی عادی ہے۔ آپ نے سنا نہیں اس نے ابھی ابھی مجھے گناہوں کی ناکارہ پوٹ کہا تھا۔

الزبتھ - ہاں! تمھارے متعلق میری "سدا بہار دوشیزہ" مجھے ابھی معلوم کرنا باقی ہے کہ اتنی رات گئے تمھاری وہ کونسی ضرورت تھی جس نے تمھیں محلسرا کی قانون شکنی پر مجبور کیا اور اس ایکٹر سے تمھارے وہ کون سے تعلقات ہیں جن کی بنا پر تم نے ..... اپنی ملکہ پر ہاتھ اٹھایا۔ --؟

نقاب پوش - جہاں پناہ! قصوروار ہوں، میری زندگی پر رحم!

شکسپیر - (طنز سے) اسی قابل ہو!

نقاب پوش - (برہمی سے) کیوں؟ کیا دنیا میں صرف تمھاری ہی زندگی قیمتی ہے، اور محض تمھیں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے؟ ...... ملکۂ عالم، جان کی امان! واقعہ یہ ہے کہ میں خطاوار ہوں۔ لیکن اس وقت اس شخص سے ...... ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کرنے کے لئے آئی تھی۔ آہ! ملکۂ عالم اگر آپ رنج و غم اور مسرت و انبساط کی حقیقت معلوم کرنا چاہیں تو اس شخص سے گفتگو کر دیکھیں جو کبھی انسانیت کے درجہ سے بلند ہو کر فرشتہ نظر آنے لگتا ہے اور کبھی صرف الفاظ کے ردّ و بدل سے حیوان مطلق معلوم ہونے لگتا ہے ..... کبھی فرطِ مسرت سے روح کو مخمور کر دیتا ہے اور کبھی دل توڑ کر خون کے آنسو رلوا دیتا ہے، پھر اس میں یہ قدرت بھی موجود ہے کہ دل کے انھیں ناقابل اندمال زخموں کو بات کی بات میں خوشامدانہ الفاظ اور پیاری نگاہوں کے طلسم سے اس طرح مندمل کر دیتا ہے کہ کوئی عورت اس کے

فریب سے نہیں بچ سکتی ۔ . . . . . . اس کے پاس محض الفاظ ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ "الفاظ کا بادشاہ" ہے ۔ !

شیکسپیر ۔ سب مغالطہ میں ڈالنے کی باتیں ہیں ۔ (ملکہ کے سامنے دوزانو ہو کر) ملکۂ محترم میں اپنا معاملہ شاہی حضور میں پیش کرتا ہوں، مجھے تسلیم ہے کہ میری زبان میں خطرناک حد تک صاف گوئی اور ترش بیانی شامل ہے، مجھ سے شاہی آداب بھی نہیں آتے، اور مجھے شاہی حضور میں گستاخی کرنے کا اعتراف ہے ۔ لیکن ملکۂ عالم انصاف کریں کہ میں خوشامد اور تعریف بیجا کرنے والوں میں تو نہیں ہوں ۔

الزبتھ ۔ بالکل اس کے برعکس، تعریف تو بڑی بات ہے میرے نزدیک تو تم سے زیادہ صاف گو اور ترش بیان شاید ہی دنیا میں کوئی ہو ۔

(شیکسپیر اظہار تشکر کے بعد اٹھتا ہے)

نقاب پوش ۔ ملکۂ عالم یہ اپنے انداز گفتگو سے اس وقت بھی آپ کو مغالطہ دے رہا ہے ۔

الزبتھ ۔ کیا واقعی ؟

شیکسپیر ۔ نہیں ملکہ، اس کا رشک اس سے یہ الفاظ کہلوا رہا ہے ۔ خدا نہ کرے کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کہہ کر کسی کو دھوکا دوں ۔ آپ نے ابھی کہا تھا کہ میں ایک رحم دل شہزادی ہوں ۔ لیکن یہ کہاں کی رحم دلی تھی کہ آپ نے اپنی شخصیت تو پردۂ راز میں رکھ کر حسن بے محابا کے آزاد حربوں کو میری جان ناتواں کے ساتھ کھیلنے کے لئے چھوڑ دیا ۔ اب حقیقی حسن کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں خود کو اس سیاہ چشم، سیاہ گیسو اور سیاہ پوش نازنین کی بے معنی محبت میں گرفتار رکھ سکوں جس کی ہر بات فریب ہے ۔

نقاب پوش ۔ (غصہ اور خجالت سے بیتاب ہو کر) ملکہ ! اس نے اب سے قبل کم از کم دس مرتبہ مجھ سے اسکا اظہار کیا ہے کہ انگلستان میں ایک دن آئے گا ۔ جب سیاہ چشم و سیاہ گیسو نازنینیں تمام یوروپ سے خراج تحسین وصول کریں گی ۔ اور دنیا میری طرح ان کی تعریف و توصیف کے راگ گائے گی ۔ (شکسپیر کی طرف برہمی سے دیکھ کر) انکار کر اگر انکار کی جرأت ہے ۔ . . . . خدا کی پناہ ملکۂ عالم جھوٹ اور فریب اس شخص کے خمیر میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں ۔ یہ کبھی توصیف و ثنا کر کے مجھے عرش پر پہونچا دیتا ہے ۔ اور کبھی اظہار حقارت سے تحت الثریٰ میں ڈال دیتا ہے ۔ میں ان رات دن کے دھوکوں سے عاجز آگئی ہوں ۔ اور شرم و غیرت سے زمین میں گڑ جاتی ہوں ۔ جب یہ خیال کرتی ہوں کہ میں نے محبت کے لئے ایسے شخص کو پسند کیا ہے ۔ جسے میرا باپ میرے جوتے تک اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتا ۔ جو تمام دنیا کو

میری محبت کے فسانے سنا کر میرا راز طشت از بام کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو تھیٹر دن کے اسٹیج پر میرے دوشیزہ جذبات کی تشریح کرکے مجھے وہاں حجاب سے گردن جھکا دینے پر مجبور کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو اپنی نظموں اور غزلوں میں میری عریاں تصویریں کھینچ کر میرے وقارِ نسائیت کی توہین کرتا ہے ——— اس نے مجھے پامال کر دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے معلوم نہیں میں جہاں پناہ سے کیا کہہ رہی ہوں اور رنج و غم کی رَو میں کدھر بہی جا رہی ہوں ۔ آہ ! میں دنیا میں سب سے زیادہ تباہ حال اور خستہ نصیب ہوں ۔ !

شکسپیر - کیا خوب ! حزن و ملال نے آخر تیری زبان سے بھی ایک شعر کہلوا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "تباہ حال" ! "خستہ نصیب" ! ——— اچھوتی ترکیبیں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (لکھنے لگتا ہے) ———

نقاب پوش - ملکۂ عالم ! خدا کے لئے مجھے جانے دیجئے میں اس وقت اپنی ہستی سے بھی شرم محسوس کر رہی ہوں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

الزبتھ - جا ! (نقاب پوش نازنین اس کے ہاتھ چومنے کی کوشش کرتی ہے) اس کی ضرورت نہیں ۔ جا !! (نقاب پوش چلی جاتی ہے)

الزبتھ - (شکسپیر سے مخاطب ہو کر) تم نے اس نادان لڑکی کو بہت ستایا، ماسٹر شکسپیر !

شکسپیر - میں کسی کو نہیں ستاتا، بلکہ دنیا مجھے ستانے کے لئے بنی ہے، تم نے جوپیٹر اور سیمیلی کی داستان سنی ہے ؟ اگر میں اس وقت ان بجلیوں کا رُخ اُدھر نہ پھیر دیتا تو خود جل جاتا !

الزبتھ - تمہیں اپنی شخصیت کا بہت غرور ہے، ماسٹر شکسپیر اور یہ غرور تمہاری ملکہ کو پسند نہیں ہے ۔

شکسپیر - ملکہ ! کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں بھی عام شاعروں کی طرح جھوٹے عجز و انکسار سے اپنے جائز وقار کو پامال کردوں اور اس الہامی معجزے کو مٹی میں ملا دینے کی کوشش کروں جو تمہارے زمانۂ حکومت کا ایک "یادگار کارنامہ" ہے ۔ میں خود پیشین گوئی کر چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ "کسی پرشکوہ قصرِ مرمریں یا کسی شاندار مقبرۂ شاہی کو اتنا قیام اور اتنی زندگی نصیب نہ ہو سکے گی جتنی میرے الفاظ کو، جن سے میں دنیا کو حسب مرضی "بہشت مسرت" اور "دوزخ آلام" بنا دینے کی قدرت رکھتا ہوں ۔ اور اگر ملکہ میری ایک درخواست منظور کر لے تو پھر میری شخصیت اور اس کی اہمیت اور بھی سوا ہو جائے ۔

الزبتھ - میں یقین کرتی ہوں کہ وہ درخواست ایسی نہ ہوگی جسے ایک کنواری ملکہ کے سامنے پیش کرنے سے اس کے وقارِ دوشیزگی کی توہین ہو ۔ یہ جملہ کہنے کی اس وجہ سے ضرورت ہوئی کہ میں آپ کی صاف گوئی سے کافی چونک گئی ہوں ۔ آپ یہ بھی ذہن سے فراموش نہ کریں کہ میں آپ جیسے مرتبہ کے آدمیوں کو (اگر مرتبہ کے لفظ سے

آپ کے پدر بزرگوار کی کوئی توہین نہیں ہوتی ہے۔) اخلاقی حدود سے متجاوز دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

شکسپیئر۔ مطلق نہیں ملکہ عالم اب یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ میں خودکو فراموش کرکے آپ کی یا آپ کے وقار دوشیزگی کی اہانت کروں۔ حالانکہ میں بآسانی تمھیں اپنی اطاعت پر مجبور کرسکتا ہوں۔ تمھارا وقار شاہی اور تمھاری معصوم دوشیزگی صرف اتنی دیر میں افسانۂ ماضی بن سکتی ہے۔ جتنی دیر میں بجلی کی شعاع دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہونچ جاتی ہے۔ لیکن چونکہ تم قوم کی ناموس اور انگلستان کی ملکہ ہو اس لئے نہ میری ملکیت ہوسکتی ہو نہ شاہ اسپین کی نہ اور کسی فانی انسان کی۔ یہی سوچکر میں قناعت کرچکا ہوں اور آپ سے آپ کو نہیں مانگتا بلکہ کچھ زمین چاہتا ہوں!

الزبتھ۔ (تعجب سے) زمین! —— واہ ماسٹر شکسپیئر! آخر تم بھی عام درباریوں کی طرح زمین ہی کے طالب ہوئے۔ تمام دنیا ایک ہی مرض میں مبتلا ہے۔

شکسپیئر۔ "دنیا ایک ہی مرض میں مبتلا ہے"...... کیا جملہ ہے! —— ملکۂ عالم کی اجازت سے! (نوٹ بک نکال کر لکھنے لگتا ہے)

الزبتھ۔ (شکسپیئر کے ہاتھ سے نوٹ بک جھٹک کر) تمھاری نوٹ بک نے مجھے پریشان کردیا ہے!.... اسے رکھو، میں یہاں تمھیں ڈرامے لکھوانے کے لئے نہیں آئی ہوں!

شکسپیئر۔ بے شک لکھوانے کے لئے نہیں بلکہ القا کرانے کے لئے اور "روح الہام" بننے کے لئے آئی ہو۔ خدا نے آپ کے ملکوتی مجسمہ کو تخلیق ہی اس وجہ سے کیا ہے۔ خیر، یہ جملۂ معترضہ تھا.......... وہ زمین جو میں حکومت سے چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی ذات کے لئے اس کا متمنی نہیں ہوں بلکہ ملکۂ عالم سے یہ گذارش ہے کہ لندن میں ایک شاندار اسٹیج تعمیر کرایا جائے، ایسا اسٹیج جو بجا طور پر انگلستان کا قومی اسٹیج کہا جاسکے۔ اور صحیح طور پر ملکۂ انگلستان کے شاہی وقار کے شایان شان ہو۔ اس اسٹیج کے ساتھ ایک اسکول چلایا جائے جس میں باقاعدہ اصولی طور پر ایک آرٹ کی حیثیت سے ڈراما کی تعلیم دی جائے اور اس کے بلند ترین نکات سے آگاہ کیا جائے۔

الزبتھ۔ تھیٹر تو اب بھی شہر میں کافی ہیں لیکن تمھاری درخواست نامنظور نہیں کی جاسکتی۔ آرٹ کی حیثیت سے ڈراما کی تعلیم میں نہیں سمجھ سکتی کہ قوم کے لئے سودمند ہوگی یا نہیں بہرحال یہ کام تمھارے مشورہ کے مطابق ہوگا ضرور. ...... (گھڑی ایک بجاتی ہے، اور پہرے دار اپنی ڈیوٹی پر واپس آتا ہے۔)

...... اچھا تو اب وقت کا تقاضہ یہ نہیں ہے۔ کہ کنواری ملکہ اتنی رات گئے۔ خوابگاہ چھوڑ کر بائیں باغ کی تنہا تاریکی میں اپنی رعیت کے شریر ترین اور لاابالی شخص سے گفتگو کرے۔ (اسٹریچو

پہرہ دار (آگے بڑھ کر) ہوشیار!! آج قصر شاہی کی حفاظت پر کون پہرے دار ہے؟!

پہرہ دار - (سلامی اتار کر) ملکۂ جہاں پناہ زندہ باد!!

الزبتھ - دیکھو! آئندہ اپنی ذمہ داری کا پورا احساس رکھو! تم نے آج سلطنت کے خطرناک ترین نوجوان کو شاہی خوابگاہ کے دروازے تک پہونچ سنے دیا - اور غافل رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو یہ موجود ہے (شکسپیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اب تم اسے بحفاظت تمام باہر پہونچا دو - اور جس وقت تم پورا اطمینان کر کے پھاٹک کو مقفل کر دو، مجھے فوراً واپس آکر اطلاع دو - اس لیے کہ میں خوابگاہ میں اس وقت تک اپنا لباس اتارنے سے بھی ڈرتی ہوں - جس وقت تک مجھے یہ یقین نہ ہو جائے کہ محل کے آہنی دروازے ہمارے ان کے درمیان حائل ہو چکے ہیں -

شکسپیر - (ملکہ کے ہاتھ کو بوسہ دیکر) ملکۂ عالم! میرا جسم آہنی دروازہ سے باہر تاریکی کی سیر دہو رہا ہے - مگر میرا خیال ملکہ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا -

الزبتھ - ایں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا میری خوابگاہ میں بھی؟

شکسپیر - نہیں ملکۂ عالم! تمھاری دعاؤں میں اور تمھاری یادداشت کے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اُمید ہے کہ اسٹیج کی درخواست فراموش نہ کی جائے گی -

الزبتھ - مجھے خوب یاد ہے میری دعائیں بھی تمھارے عمل کی شریک ہیں - خدا کو فراموش نہ کرنا اچھا! شب بخیر، ماسٹر "ولیم"!!

شیکسپیر - (جھک کر) شب بخیر! الزبتھ اعظم، خدا ملکہ کو سلامت رکھے!!

الزبتھ - آمین!

(دونوں چل دیتے ہیں، ملکہ اپنی خوابگاہ کی طرف، اور شکسپیر پہرہ دار کی حفاظت میں بیرونی پھاٹک کی طرف)

(برنرڈ شا)

طالب بانبھتی

عہدِ اسلام میں کنیزوں کا اثر و اقتدار

ایک انسان کا دوسرے انسان کو غلام بنا کر رکھنا تاریخ انسانی کی نہایت قدیم یادگار ہے۔ اور اس کی ابتدا کا سُراغ اِس وقت سے چلتا ہے جب دو افرادِ انسانی میں سے ایک نے اپنے کو قوی اور دوسرے نے ضعیف محسوس کرنا شروع کیا۔ غلامی نام ہے صرف قوت کے اعتراف کا اور قوت کا محبوب ترین مشغلہ یہی ہے کہ وہ مغلوب و کمزور پر حکومت کرے، اِس کو ستائے اور خدمت و چاکری کی صورت میں برابر اس سے اپنی قوت کا اعتراف کراتا رہے۔

اس لئے دنیا میں غلامی کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی جب اول اول انسان میں قبائلی زندگی کا آغاز ہوا اور سرداران قبیلہ نے جنگ و مقابلہ کے بعد فتح و نصرت کا خراج انسانی خدمت کو قرار دیا۔ پھر چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ حرب و جنگ بھی ترقی کرتی رہی، اس لئے دنیا میں اسی نسبت سے غلامی کا رواج بھی وسیع ہوتا گیا۔ اول اول اسیران جنگ کو غلام نہیں بناتے تھے۔ بلکہ قتل کر ڈالتے تھے، البتہ عورتیں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ اور ان سے ہر طرح کی خدمت لی جاتی تھی۔ بعد کو یہ رواج اسقدر وسیع ہوا کہ زمانۂ امن و صلح میں بھی لوگ غلام بنائے جانے لگے۔ اور دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں تھا جہاں یہ رسم قائم نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ قدیم مصریوں، اہل اشوریہ، ہندوؤں، چینیوں، یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں وغیرہ تمام اقوام مشرق و مغرب نے مستقل بازار بردہ فروشی کے قائم کئے جہاں دوسری اجناس کی طرح انسان کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔

اہل عرب عہد جاہلیت میں اسیران جنگ کو بھی غلام بناتے تھے۔ اور ان کو بھی جنھیں وہ پڑوس کی قوموں سے خریدتے تھے، چنانچہ غلاموں کے تاجر حبش وغیرہ کی طرف سے لونڈی غلاموں کی ایک جماعت ہر موسم میں عرب لے جاتے تھے۔ اور وہاں کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔

قریش اس باب میں زیادہ مشہور تھے اور غلاموں کی تجارت وہ اسیطرح کرتے تھے جیسی دوسری چیزوں کی، چنانچہ اس قبیلہ کا سردار عبداللہ بن جدعان عہد جاہلیت میں نہایت مشہور تاجر غلاموں کا مانا جاتا تھا۔ (المسعودی صفحہ ۲۸۲ جلد ا)

وہاں غلام بطور ہدیہ کے بھی دیے جاتے تھے اور دوسری ملکیت کی طرح وراثت میں بھی منتقل ہوتے تھے۔ جب کوئی شخص غلام خریدتا تھا تو اس کی گردن میں جانور کی طرح رسی ڈال کر گھر کو لے جاتا تھا۔ (المعارف لابن قتیبہ ص ۱۱۲)

قمار بازی کے سلسلہ میں بھی بعض لوگ غلام بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ابولہب اور عاصی بن ہشام نے آپس میں جوا کھیلا اور شرط یہ قرار پائی کہ جو ہارے گا وہ دوسرے کا غلام ہو جائے گا۔ چنانچہ ابولہب جیتا اور اس نے عاصی بن ہشام کو غلام بنا کر اونٹ چرانے کی خدمت اس سے لی (الاغانی ص ۱۰۰ ج ۱)

جب اسلام کا آغاز ہوا تو بردہ فروشی کا عرب میں انتہائی عروج تھا۔ اور دنیا کی تمام دوسری قوموں کی طرح یہ بھی پوری طرح اس لعنت میں مبتلا تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کا رسم و رواج جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے دفعۃً نہیں مٹایا جا سکتا۔ بلکہ آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی ہے اس لئے اسلام فوراً اس کو بند تو نہ کر سکتا تھا، لیکن اس نے بعض اصول و قوانین ایسے پیش کئے جن پر عمل کرنے سے اس مذموم رواج کا کم ہو جانا اور غلاموں کی حالت میں اصلاح کا رونما ہونا لازم تھا چنانچہ بردہ فروشی کے دائرہ کو تنگ کرنے کے لئے اسلام نے صرف انھیں لوگوں کو غلام بنانے کی اجازت دی جو اسیران جنگ کی حیثیت سے ہاتھ آئیں اور جو نہ مسلمان ہوں، نہ جزیہ ادا کریں۔ ہر چند یہ صورت بردہ فروشی کی وسعت کو کم کرنے والی تھی۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ اس کو وسیع ہونا تھا۔ اور ہوئی، چنانچہ بعض جنگوں میں ایک ایک سپاہی کو سو سو غلام اور سو سو کنیزیں تقسیم ہوئیں اور امراء و سرداران کو ہزار ہزار۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ہزار غلاموں کے مالک تھے۔ اور واقعۂ ارک کے بعد ایک ایک درہم میں لونڈی غلاموں کو فروخت کیا گیا۔ غلاموں کی کثرت کا ایک سبب عہد اسلام میں یہ بھی تھا کہ بربر وغیرہ کے بعض ذمی، جزیہ کے عوض غلاموں ہی کو پیش کرتے تھے۔

اسلام نے ایک طرف غلامی کا دائرہ تنگ کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ان کی تعلیم و تہذیب کی ہدایت کر کے سوسائٹی میں ان کے مرتبہ کو بلند کرنا چاہا، چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے:۔

من کانت لہا جاریۃ فعلمہا واحسن الیہا وتزوجہا

کان لہا اجران ..... اجر بالزواج والتعلیم

واجر بالعتق۔

(یعنی اگر کوئی شخص اپنی کنیز کو تعلیم دے گا، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔ اور شادی کر لے گا تو اس کے لئے دو اجر ہیں۔ ایک اجر نکاح و تعلیم کے عوض میں، دوسرا آزاد کرنے کے صلہ میں۔)

چنانچہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ غلاموں کو بلاد اسلامیہ میں وہی حقوق حاصل تھے جن سے آزاد لوگ متمتع ہوتے تھے۔ اور معاملات میں اتنی رعایت ملحوظ تھی۔ کہ ایک غلام کو بہ نسبت آزاد کے نصف سزا ملتی تھی۔

لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے اور ان کو آزاد کر دینے کی ہدایت کرنا، اسلام کی بڑی زبردست حکمت تھی۔ اور عربوں

کے حالات وافتاد طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس سے بہتر طریقہ اس رسم قبیح کے انسداد کا کوئی اور ہو ہی نہ سکتا تھا، چنانچہ تاریخ اسلام میں کثرت سے ایسے واقعات ملیں گے کہ لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بعد ان کی اولاد نے سوسائٹی میں کتنا عظیم مرتبہ حاصل کیا اور لوگوں نے کس قدر کثرت کے ساتھ غلاموں کو آزاد کیا ——————

جہاں تک اسلام کی تعلیم کا تعلق ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہ سکتا کہ اس نے اس رسم کے دور کرنے کی پوری کوشش نہیں کی، البتہ سلطنت اسلامی نے اس ہدایت کی غایت کو نظر انداز کیا اور بردہ فروشی کا سلسلہ امارت وسیادت کی اور بہت سی ناجائز خواہشات کی طرح، بدستور قائم رہا۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس رسم کے قیام کے اس کی نوعیت بہت کچھ بدل گئی اور کنیز جو عہد اسلام سے قبل ایک جنس ناکارہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کی ذہنی دماغی و معاشرتی ترقی کس حد تک پہونچ گئی۔

گذشتہ بیان سے معلوم ہوا ہوگا کہ عربوں میں بعد آغاز اسلام کنیزوں کی کثرت کا سبب فتوحات کی وسعت تھی۔ کہ باوجود ہزاروں کی تعداد میں آزاد کر دینے کے بھی ایک کثیر تعداد ان کے پاس رہتی تھی۔ جب امارت وحکومت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تمدن و معاشرت، عمران و تہذیب، جاہ وحشمت، شوکت وجلال میں ترقی ہوئی تو امراء وخلفاء کے حضور میں کنیزوں کے پیش کئے جانے کا دستور قائم ہوا، گویا کہ وہ بھی زر وجواہر کی طرح ایک چیز ہدیہ کے قابل سمجھی جاتی تھی۔ اگر معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی امیر کو صناعت کی طرف توجہ ہے تو اس کے سامنے صناع کنیز پیش کی جاتی تھی۔ اور اگر جمال وغنا کی طرف کوئی خلیفہ مائل ہوتا تھا تو انھیں خصوصیات کی حامل کنیز ڈھونڈھ ہی جاتی۔ رفتہ رفتہ یہ دستور بہت وسیع و عام ہو گیا۔ اور عہد بنی عباس میں تو اس کے تمام جمالیاتی پہلو کھل کر رہ گئے —————— کنیزوں کے ساتھ جب خلفاء عہد نکاح کر لیتے تھے تو انھیں آزاد کر دیتے تھے۔ اور پھر ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ متوکل کے پاس ۴۰۰۰ کنیزیں تھیں۔ (المسعودی ص ۲۷۹ ج ۲) اور ہارون الرشید کے پاس ۲۰۰۰، جن میں سے ۳۰۰ ارباب نشاط میں شامل تھیں۔ اور گانے بجانے کی ماہر تھیں (الاغانی ص ۸۸ ج ۲) محض زینت وآرائش اور نمائش جاہ وجلال کے لئے بھی کنیزوں کو رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ زبیدہ اور اُم جعفر برمکی کے پاس ہزاروں کنیزیں صرف اس لئے تھیں کہ ان سے شان وشوکت کا اظہار ہو۔

جب فتوحات کا سلسلہ محدود ہو گیا اور لڑائیاں بند ہوئیں تو کنیزوں کی فراہمی بھی کم ہونے لگی، لیکن چونکہ لوگ ان کے رکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس لئے ایک جماعت بردہ فروشوں کی پیدا ہو گئی جو بلادِ ترک وصقالبہ، ہند، آرمینیا، روم، اور افریقہ وغیرہ سے نوجوان لڑکیاں کسی نہ کسی طرح لاتے تھے اور یہاں فروخت کرتے تھے۔

اس تجارت کے لیے یہاں بڑے بڑے بازار قائم تھے جہاں کنیزوں کی خرید وفروخت نہایت کثرت سے ہوتی تھی بغداد کا بازار اس باب میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ بہت کھلے ہوئے میدان میں تھا۔ اور اس کا نام "سوق الرقیق"، یا، "سوق النخاسین" تھا۔ اس میں متعدد مکان، دوکانیں اور احاطے تھے۔ جہاں مختلف ملکوں کی کنیزیں، عمر ورنگ،

زبان و لباس، تہذیب و علم کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ رکھی جاتی تھیں - یوں تو یہاں سرکیشیا، روم، جارجیا، صقلبیہ، ایران، ارمنیا اور حبش وغیرہ تمام اطراف ملک کی کنیزیں آتی تھیں، لیکن سب سے زیادہ قیمتی وہ کنیزیں ہوتی تھیں جو مدینہ، طایف، بصرہ، کوفہ، بغداد و مصر سے حاصل کی جاتی تھیں، کیونکہ یہ نہایت ہی شیریں کلام اور حاضر جواب ہوتی تھیں -

اس بازار کا ایک حصہ صرف ان کنیزوں کے لئے وقف تھا جو بالکل تازہ وارد ہوتی تھیں اور غیر تربیت یافتہ حالت میں فروخت کردی جاتی تھیں۔ بالکل عریاں حالت میں لائی جاتی تھیں - اس حال میں کہ ان کے بال کھلے ہوتے تھے - اور زینت و آرایش کا کہیں نام نہ ہوتا تھا - اس سے مقصود یہ تھا کہ ان کا طبعی حسن جو صنعت آرایش سے علیحدہ ہو، ہر شخص کو معلوم ہو سکے - بڑے بڑے تاجران کی شکل و صورت، رعنائی و دلکشی کا اندازہ کرکے مختلف داموں میں خرید لیتے تھے - اور پھر ان کے فطری ذوق کے لحاظ سے ان کو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کرکے بہت گراں قیمت پر فروخت کرتے تھے - چنانچہ عہد اسلام کی بہت سی مشہور ماہر موسیقی، صاحب علم و فضل اور سیاست داں عورتیں انھیں کنیزوں سے تعلق رکھتی تھیں -

اول اول جب یہ بازار میں آتی تھیں تو اُن کی وحشت و خشونت کا وہی عالم ہوتا تھا جو ایک نوگرفتار ہرنی کے اضطراب کا، لیکن جب تعلیم و تربیت کے بعد، مکلف لباس سے آراستہ، اور فن دُلربائی کی گھاتوں سے واقف ہو کر، ہاتھ میں رباب، زبان پر نغمۂ شیریں[1]، نگاہوں میں دلربایانہ افسوں اور جسم میں حرکات رقصیہ کا لوچ لئے ہوئے نکلتیں تو طبقۂ امرا میں تہلکہ مچ جاتا - اور وہی کنیز جو چند درہموں میں خریدی گئی تھی، لاکھوں میں فروخت ہوتیں -

اگر نفس بردہ فروشی کی کراہت سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا - کہ اہل عرب کنیزوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے - وہ ان کے قوائے ذہنیہ کو تباہ کرنے والا نہ تھا بلکہ ان کو مہذب و شایستہ بنانے والا تھا - اس سلسلے میں جسقدر وحشی و ناتراشیدہ عورتیں زیور علم و فضل سے آراستہ کی گئیں - ان کا شمار مشکل ہے اور انھیں کنیزوں میں جیسی جیسی صاحب علم و فضل عورتیں ہوئیں - اور خود ان کے بطن سے جیسے جیسے خلفاء عظام، اور علماء کرام پیدا ہوئے، ان کے حالات سے تاریخ عرب کے صفحات مالامال ہیں -

ان بازاروں میں کنیزیں علی العموم نیلام کی صورت سے فروخت کی جاتی تھیں - یعنی جب کنیزوں کے خریدار خواہ وہ امرا ہوں یا تجار جمع ہو جاتے اور بازار مختلف ممالک کی کنیزوں سے بھر جاتا تو کنیزیں فروخت کرنے والے کھڑے ہو جاتے اور نہایت بلند آواز سے اپنی کنیزوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتے :-

---

[1] ان کے تغزل و غنا کا صحیح رنگ کیا تھا اس کا اندازہ اس وقت کے گیتوں سے ہو سکتا ہے - صاحب اغانی نے جا بجا ان گیتوں کا ذکر کیا ہے - ان میں سے دو نہایت مشہور و محبوب وہ تھے - جن کی ابتدا ان فقروں سے ہوتی ہے: "من کان لنا، لنا لہ" (یعنی جو ہمارا ہے ہم اس کے ہیں) "وضع الخد للہوی عز" (فرط محبت سے گال پر گال رکھ دینا کسقدر پیاری بات ہے)

یا تجار، یا ارباب الاموال اما کل مدورة جوزة، و کل مستطیلة موزة، ولا کل حمراء لحمة، ولا کل بیضاء شحمة، ولا کل صہباء خمرة، ولا کل سمراء تمرة، یا تجار، ہذہ الدرة الیتیمة اللتی لا تفی الاموال لہا بقیمة بکم تفتحون باب الثمن،،

(اے تاجرو، اے دولتمندو، نہ ہر گول چیز اخروٹ ہوتی ہے نہ ہر مستطیل چیز کیلا، ہر وہ چیز جو سرخ ہے گوشت نہیں کہلاتی اور نہ ہر سپید چیز چربی، اسی طرح نہ ہر صہبا شراب ہوتی ہے اور نہ ہر زرد چیز کھجور۔ اے تاجرو، یہ ایک بے بہا موتی ہے کہ زر خطیر بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتا۔ پھر بتاؤ کہ تم کیا قیمت اس کی لگاتے ہو)

اس آواز پر لوگ چاروں طرف سے گھیر لیتے اور بولی شروع ہو جاتی۔ کوئی چار ہزار دینار کہتا تو کوئی پانچ ہزار، کسی طرف سے چھ ہزار کی آواز آتی اور کہیں سے ۸ ہزار کی الغرض اخیر میں سب سے زیادہ قیمت لگانے والا۔ وہ دُرِ بے بہا پا جاتا اور اپنے گھر کو چلا جاتا۔

یہ بھی قاعدہ تھا کہ (قدیم اہل رومہ کی طرح) غلاموں اور کنیزوں کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کر دیتے اور لوگ آ آ کر انھیں دیکھتے اور ہاتھوں سے چھوتے۔ چونکہ یہ لوگ لونڈی غلاموں کے عیوب کو بالکل اسی طرح چھپاتے تھے۔ جیسے گھوڑوں کے عیوب چھپائے جاتے ہیں، اس لئے خریدار کو یہ حق بھی حاصل ہوتا تھا کہ وہ ان کو بالکل عریاں حالت میں دیکھ سکے۔

اہل عرب نے مختلف ممالک کی کنیزوں کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات متعین کر کے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر نجابت کی جستجو ہے تو فارس کی لونڈیاں لی جائیں، اگر خدمت مقصود ہے تو رومہ کی کنیزیں تلاش کی جائیں، اسی طرح کھانا پکانے کے لئے حبش کی کنیزیں، اور بچوں کی تربیت و رضاعت کے لئے آرمینیا کی لونڈیاں مخصوص سمجھی جاتی تھیں۔ حسن ظاہری کے لحاظ سے چہرہ ترکی کا، جسم روم کا، آنکھیں حجاز کی، اور کمر یمن کی پسند کرتے تھے۔

حال ہی کی بات ہے کہ بردہ فروشی کے انسداد سے قبل آستانہ، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے بازاروں میں سرکیشیا کی کنیزیں عام طور پر بالکل عریاں حالت میں فروخت کی جاتی تھیں۔ بعد کو جب ایک بین الاقوامی قانون اس تجارت کے خلاف ہر جگہ نافذ ہو گیا تو لوگوں نے خفیہ طور پر اپنے گھروں میں اس تجارت کو جاری رکھا۔

قدیم زمانہ میں بھی کوئی قوم بردہ فروشوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ لیکن اسلام نے جس قدر اس پیشہ کی حقارت کی ہے شاید کسی نے نہیں کی۔ رسول اللہ کا ارشاد تھا کہ "التجارۃ فی الرقیق ممحقۃ" (یعنی

بردہ فروشی قوم کو تباہ کر دینے والی ہے) کتاب الولید میں بردہ فروش اور شیطان کو ایک مرتبہ میں رکھا ہے۔ اسی لئے عساکر اسلامیہ کے ساتھ ان تاجروں کے رہنے کی سخت ممانعت تھی تاکہ وہ دشمن کے بچوں کو پکڑ کر غلام نہ بنائیں اور ان کی عورتوں کو اہل لشکر کے سامنے پیش نہ کر سکیں جیسا کہ اہل رومہ کا دستور تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، بغداد اس تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اور جمیل ترین کنیزیں یہیں کے بازار میں آتی تھیں۔ اور نہایت گراں قیمت میں فروخت ہوتی تھیں۔ ان کنیزوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا تاجر اور خصوصیت کے ساتھ اس عہد کے مشہور مغنی، کسی کنیز کو اس کا ذہن قیافہ دیکھ کر خرید لیتے، پھر اس کو قرآن حفظ کراتے ادب و نحو کی تعلیم دیتے، منزلی تہذیب سکھاتے، اشعار یاد کراتے، موسیقی کا ماہر بناتے۔ اور پھر بازار میں لاکر سو کے ہزار وصول کرتے۔ خوبصورت کنیزوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کا بہت رواج تھا۔ کیونکہ وہ کنیزیں جن میں ان دونوں کا اجتماع ہوتا۔ بیش بہا چیز سمجھی جاتی تھیں۔ علی الخصوص مولدات (یعنی مکہ و طایف وغیرہ کی کنیزیں)، کہ ان کی گرانی کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ایک کنیز کی قیمت ایک لاکھ دینار ادا کی (ابن خلکان ص ۱۰۶ ج ۱) اسی طرح سلیمان بن عبدالملک کے بھائی سعید نے اپنی مشہور کنیز زلفار کی قیمت ستر ہزار دینار ادا کی (الطبری ص ۱۳۲ ج ۲)، جعفر برمکی نے ایک کنیز ۴۰ ہزار دینار میں خریدی (العقد الفرید ص ۲۰۲ ج ۳) ہارون الرشید نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلا حکم یہ نافذ کیا کہ فلاں کنیز ایک لاکھ دینار میں خرید کر لی جائے۔ اس کے وزیر یحییٰ بن خالد نے عذر کیا، رشید اس پر برہم ہوا تو یحییٰ نے بیت المال کی تمام چیزوں کو فروخت کر کے ۱۵ لاکھ درہم کی صورت میں اس کمرہ کے اندر رکھوا دیا۔ جہاں سے خلیفہ گزرا کرتا تھا۔ اس ترکیب سے خلیفہ کو معلوم ہوا کہ اس نے کنیز کے خرید کرنے میں کتنا بیجا صرف کیا تھا۔

ایک بار امین نے جعفر بن ہادی کو حکم دیا کہ ایک کنیز جس کا نام بذل تھا خرید لیا جائے۔ جعفر نے انکار کیا۔ تو امین نے برہم ہو کر دوسرا حکم دیا کہ سونے کے برابر اس کو وزن کر کے قیمت ادا کی جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی۔ اور ۲ کرور درہم ادا کیے گئے۔

عہد بنی امیہ و بنی عباس میں کنیزوں کا مرتبہ اسقدر بلند ہو گیا تھا۔ اور اتنا زبردست اثر انکا خلفاء پر قائم تھا کہ حکومت و سلطنت گویا انھیں کے ہاتھ میں تھی،

چنانچہ یزید بن عبدالملک کا عشق حبابہ کے ساتھ اور رشید کا ذات الخال کے ساتھ جیسی تاریخی شہرت رکھتا ہے سب پر ظاہر ہے۔ رشید کی ماں خیزران خود کنیز تھی، اسی طرح خلیفہ معتضد کی ماں سیدۃ الترکیہ لونڈی تھی۔ لیکن جو اثر ان کا سیاسیات وقت پر تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

الغرض عہد اسلام میں کنیزوں کے اثر و نفوذ اور قوت و اقتدار کا یہ عالم تھا۔ کہ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خلفاء کی لونڈیاں تھیں درست نہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ خود خلفاء اُن کے غلام تھے ——

نیاز

کاجل - سُرمہ - چُورن - منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے۔ دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو:-

"سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا، ایک شیشی اور بھیجدیجئے"

سیّد رضا، نزیر سو بنتھ (ریوت محل)

کاجل - آشوب، سُرخی، ضعف بصارت کے لئے ازبس مفید ہے۔ ایک ڈبیہ ہر ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہے۔ قیمت ایک ڈبیہ عہ

سرمہ یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے۔ اس میں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سرمہ ہے جس کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دُھند، موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ اور بار بار آزمایا ہوا ہے قیمت فی پڑیہ ایک روپیہ علاوہ محصول۔

چورن - یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے، پیٹ کا درد، قبض، نفخ ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم دستوں کا آنا، سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی دبیہ ۲ تولہ عہ علاوہ محصول۔

منجن - اسکی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ ۲ تولہ ایک روپیہ عہ علاوہ محصول۔

خوشخبری:- سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف"

م بیگم ذریعہ دفتر نگار لکھنؤ

"جب" کی ترقیاں "اب" کے مقابلہ میں

یعنی

مشرق قدیم اور مغرب جدید کی ذہانت کا فرق

(۱)

سنہ ۱۹۲۵ء ہے اور فروری کا مہینہ منطقۂ شمالی کے ایک بندرگاہ پر کچھ لوگ جمع ہیں۔ ساکت پانی پر سفید سفید برف تیرتی پھر رہی ہے۔ اور جہازوں کے مستول ہلکے ہلکے نیلگوں آسمان کے "پس منظر" پر تصویر کی طرح دلکش نظر آرہے ہیں۔ تمام بازار، شہر کے عقب کی پہاڑیاں، برف سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ اور . . . . تمام بے برگ و بار درختوں پر یہ سفید گالے اس طرح نظر آتے ہیں۔ گویا کسی بوڑھے آدمی کے سفید بکھرے ہوئے سر کے بال ہیں۔

جب آفتاب کے طلائی طشت پر آہستہ آہستہ ایک سیاہ پردہ پڑنے لگا۔ اور روشنی رفتہ رفتہ کم ہوئی۔ تو برف کی درخشانی بھی خود بخود ماند پڑ گئی۔ اس کے بعد کسوف کمل یا "سرب گرہن" ہوگیا۔ اس وقت سورج کی کرنیں اوس سیاہ پردہ کے اطراف سے اس طرح نکلنے لگیں۔ جیسے اس کے حاشیہ میں درخشاں لعل جڑدے ہوں۔ داہنی طرف کسی قدر فاصلہ پر تاریک آسمان میں عطارد، زہرہ، مشتری وغیرہ درخشاں سیاروں کا ایک جھرمٹ جھلملا رہا تھا۔ اور نظام شمسی کے گویا تمام مخفی خزائن دفعتاً ظاہر ہو گئے تھے۔

سورج گرہن تو ہوا لیکن اس سے زیادہ تاریکی نہ ہوئی جیسی شام کو دھندلکے کے وقت ہوا کرتی ہے۔ تمام بازار اور مکانوں کی چھتیں آدمیوں سے بھری پڑی تھیں۔ ان میں بہت سے وحشی تھے جو بچوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اور بظاہر ہر شخص مرعوب نظر آتا تھا۔ قمریوں اور فاختاؤں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں ادھر ادھر اڑتی پھرتی تھیں۔ خوفزدہ ہو کر نہیں بلکہ غالباً دنیا کی اس غیر معمولی حالت پر متحیر ہو کر گھبرا رہی تھیں۔

اس کے بعد وہ سیاہ پردہ آفتاب سے رفتہ رفتہ اٹھا۔ اور وہ سنہری شعاعیں جو پردہ کے اطراف سے تیروں کی

طرح نکل رہی تھیں پھر ترکش میں آگئیں - نور آفتاب چاروں طرف پھیل گیا - آسمان روشن ہوگیا - سیارے جو کچھ دیر پہلے جگمگا رہے تھے - نظروں سے غائب ہوگئے، اور برف پوش دنیا پھر سورج کی روشنی میں جگمگا اٹھی -

لیکن قلب انسان پر اس منظر کے جو تاثرات پیدا ہوئے تھے باقی رہ گئے - ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر حیران تھا - اور اپنے روز کے فرائض کو قریب قریب ہر شخص بھول گیا تھا - آفتاب اور سیاروں کے پر شوکت منظر نے ان کے قلب منور کر دیے تھے - اور اب سب سے پہلے انھوں نے سوچا کہ وہ صرف اسی بند ر گا ہ یا اسی دنیا کے باشندے نہیں، بلکہ وہ کائنات کے باشندے ہیں - اور اس خیال سے ان کے دلوں پر ایک قسم کا رعب سا چھا گیا -

یہ علم کہ ہم صرف اسی کرۂ ارض کے باشندے نہیں - بلکہ ایک وسیع کائنات کے باشندے ہیں - علم انسانی کا جائز ورثہ ہے - جہاں تک ہمارا خیال ہے دنیا کے تمام جانداروں میں صرف انسان ہی کو یہ ورثہ ملا ہے - بہت سے جانور صرف نور آفتاب سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہی ان کی تمنا کی انتہا ہے - آشیانہ بدوش فصلی جانور مختلف موسموں کے لحاظ سے گردش آفتاب کے ساتھ ساتھ ہجرت کرتے رہتے ہیں - اور اس سے زیادہ سعی و کاوش ان کے بس کی بات نہیں - ابھی صبح کا ستارہ اپنی منزلیں طے کرتا ہی ہوتا ہے کہ چنڈول اور آگن - شامہ اور لال اپنے دلکش نغمے چھیڑ دیتے ہیں، اور یہی ان کے لیے کافی ہے، جانور ان صحرائی جو رات کو شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں - صبح ہوتے ہی اپنی پناہگاہوں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں - لیکن انسان کے سوا . . . . ان جانوروں میں کوئی ایسا نہیں ہے - جو دنیائے ارضی کے علاوہ بیرونی وسعتوں پر بھی نظر ڈالتا ہو - اس لیے طیور و وحوش تو یقیناً اسی دنیا کے باشندے ہیں - لیکن انسان وہ مخلوق ہے جس کو اپنا وطن بجائے کرۂ ارض کے "کائنات" کو بنانا چاہیے -

پھر جو حال وسعت مکانی کا ہے وہی حال وسعت زمانی کا بھی ہونا چاہیے - انسان جس طرح آگے دیکھتا ہے، اسی طرح وہ اپنے . . . . . ماضی کو بھی دیکھتا ہے - لیکن دیگر ذوی الارواح (اگرچہ ان میں سے بعض کی عقل حیوانی آیندہ کے لئے خوراک کا اندوختہ رکھنے پر مجبور کرتی ہے) در اصل تمام عمر اپنے "حال" ہی میں زندگی بسر کرتے ہیں - ایک طائر کی تمام قوت شعور کا اظہار صرف اس کے وقتی چہچہوں تک محدود ہے، جو جانور ابھی ابھی موت کے منہ سے نکلتا ہے وہ چند منٹ کے بعد پھر مطمئن اور مسرور ہو جاتا ہے - نہ اس کا دل دھڑکتا ہے - نہ اس کا دماغ کچھ سوچتا ہے - لیکن انسان اپنے ماضی و مستقبل پر غور کرتا رہتا ہے - خواہ اس سے اس کو کسی قسم کی مسرت و دانش حاصل ہو یا نہ ہو -

اگر ہم آج (یعنی حال) کا مقابلہ چند روز یا سال یا صدیوں (مثلاً پانچ چھ صدی) پیشتر کے زمانہ سے کریں تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ مکان و زمان کے متعلق ہمارے خیالات بہتر بلکہ نہایت حد تک وسیع ہوگئے ہیں -

زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مغربی مفکرین کے نزدیک زمانہ کی ابتدا صرف چار ہزار اور چار سال قبل از مسیح ہوئی تھی لیکن جب ایک عجائب خانہ میں ایک مصری بت دیکھا گیا جس پر ۱۵۰۰ء قبل مسیح درج تھا تو لوگ حیران رہ گئے، کیونکہ جب زمانہ

کی ابتدا صرف چار ہزار چار سال قبل مسیح ہوئی تو یہ ڈیڑھ سو برس کا اور زاید زمانہ کہاں سے آگیا۔ اسی طرح زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ لوگوں نے "وسعت مکانی" کو بھی نہایت مختصر کر دیا تھا۔ بڑے بڑے مفکرین ہیں سے ڈانٹے (Dante) ہی کو لیجئے کہ جو دنیا اس نے بیان کی ہے وہ کسقدر مختصر ہے۔ گو اسکی متعین کی ہوئی کائنات میں کرۂ ارض کو کس قدر نمایاں اور مرکزی حیثیت ضرور حاصل ہے۔ لیکن اس کے چاروں طرف وہ فضا کا ایک تنگ حلقہ بناتا ہے۔ جس میں شمس و قمر اور دیگر چھوٹے چھوٹے سیارے تیزی سے گردش کرتے ہیں۔ اور یہ سب ہماری مرکزی دنیا کے تابع ہیں۔ اس مرکز ارضی والی چھوٹی سی کائنات کی تکوین کا زمانہ صرف چھ ہزار برس خیال کیا گیا تھا۔ گویا اس سے پیشتر زمانہ تھا ہی نہیں۔ اور جس کے فنا ہونے کے بعد بھی زمانہ نہیں رہے گا۔ مگر اب وہ زمانہ ہے کہ ہم اپنی دنیا کی عمر کم از کم ایک کروڑ برس سے کم خیال نہیں کرتے۔ اور اسی تناسب سے ہم اس کائنات کی عمر بھی شمار کرتے ہیں۔ جس میں تمام ثوابت و سیارگان منتشر ہیں گویا ہمارے خیالات جو عرصۂ دراز سے گھٹے ہوئے سے تھے۔ اب آزاد ہو گئے ہیں۔ اور کائنات کی شاندار وسعتوں کا راز فاش ہو گیا ہے۔

بااینہمہ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ زمانۂ حال میں جو اسرار کائنات ہم کو معلوم ہوئے ہیں وہ ہمارا ہی حصہ تھے۔ کیونکہ اب سے پیشتر جب اسقف اعظم یوشر ———— قدیم عبرانیوں کی روایات پر اعتماد کر کے یہ نتیجہ نکال رہا تھا۔ کہ تخلیق کائنات صرف چار ہزار چار سال قبل مسیح ہوئی تھی، اس وقت مشرق کی قدیم قومیں اُس اسقف اعظم سے زیادہ وسیع الخیال نظر آتی تھیں۔ چنانچہ جب حکیم سولن ملک مصر میں گیا۔ اور وہاں اس نے مندروں کی سیر کی تو اسے بتایا گیا کہ ملک یونان کی تاریخ صرف ایک ہزار سال سے نہیں بلکہ دس ہزار سال سے شروع ہوتی ہے۔ مگر یونانی اپنی تاریخ کو بھول گئے ہیں۔

جو حال زمانہ کا تھا وہی حال مرکز ارضی والی دنیا کا تھا۔ ڈانٹے نے بطلیموس کا اتباع کیا جس نے دوسری صدی عیسوی میں نظام شمسی کا گھروندا بنا کر کھڑا کیا۔ مگر بطلیموس سے بھی بہت پہلے حکیم فیثاغورث اور اس کے تلامذہ دنیا کو یہ سکھا چکے تھے کہ کرۂ ارض آزاد طور پر اپنے فلک پر معلق گردش کرتا ہے اور اس ... کا مرکز بہت دور ہے۔ ان لوگوں نے دنیا کو یہ بھی بتایا تھا کہ آفتاب بھی فضا میں حرکت کرتا ہے۔ کاپرنیکس اور گلیلیو ہی جدید نظام شمسی کے قائم کرنے والے تھے بلکہ ان سے پیشتر ساماین اعظم حرکت شمسی کا راز دنیا کو بتا چکا تھا۔

ایام بلیکس نے بیان کیا ہے کہ فیثاغورث نے بھی ملک مصر میں علم حاصل کیا تھا۔ جہاں وہ مندروں کی تنہائیوں میں بیس برس تک فلکیات اور جیومیٹری کا مطالعہ کرتا رہا تھا، اور انہی مندروں میں گوشہ نشین ہو کر وہ اسرار ربانی سے آگاہ ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جب کمبی سوس کی فوج فیثاغورث کو گرفتار کر کے بابل لے گئی تو وہاں اس نے نہایت خوشی سے مجوسیوں کے علوم و فنون کا مطالعہ کیا۔ اور وہیں اس نے بارہ برس رہ کر علوم ہندسہ اور موسیقی پر عبور حاصل کیا۔ وہ مجوسیوں کے مقدس علوم دینی میں بھی کامل ہو گیا۔ اس طرح وہ حکیم فیثاغورث جس نے مغربی دنیا کے لئے اصطلاح "فلسفہ"

وضع کی قدما کا رہین منت تھا۔ اور ابھی حال میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مشہور بابلی نجومی کدینو استقبال فلکی، اور اعتدال ربیعی کے راز سے بھی واقف تھا۔ اب تک اس راز کا جاننے والا ہپارکس کو سمجھا جاتا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ راز پہلے ہی کھل چکا تھا۔

(۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ ماضی کی وسعت خیال کو رفتہ رفتہ کس قدر زوال ہو گیا تھا۔ متاخرین کی تنگ خیالی سے قدما کی وسیع کائنات سکڑ کر کتنی مختصر رہ گئی تھی، اور دنیا کی چھ ہزار سال کی عمر کا خیال ذہن انسانی پر کس قدر حاوی ہو گیا تھا۔

اب سے ڈیڑھ سو برس قبل جب انگلستان کے مفکرین سنسکرت کے علوم و فنون کا مطالعہ کرنے ہندوستان پہونچے تو ان کے ذہن بھی اسقف اعظم اوشر کی گرفت میں جکڑے ہوئے تھے۔ جہاں تک وسعت زمانہ کا تعلق ہے۔ سر ولیم جونس، چارلس ولکنس اور ان کے قابل رفقاء کے دماغ میں بھی وہی اسقفی تقویم موجود تھی۔ یعنی سب یقین رکھتے تھے۔ کہ کائنات کی ابتداء چار ہزار چار سال قبل مسیح ہوئی ہے۔ پھر چونکہ اس وقت تک مصری ہیروغلیفی، مصری تقویم اور ان طویل صدیوں کا راز جو بابل و نینوا کی الواح پر خط میخی میں درج ہیں۔ دنیا کو معلوم نہ ہوا تھا۔ اس لئے انگریز محققین جس وقت ہندوستان میں آئے تو انھوں نے ہندوستان کی تقویم مہ و سال کو اسی «شش ہزاری گز» سے ناپنا شروع کیا۔ جو اسقف اعظم نے مقرر کر دیا تھا۔ اور جس میں طوفان نوح کا وقت ۲۳۴۹ سال قبل مسیح رکھا گیا تھا۔ حتے کہ میکس میولر جیسے فاضل نے بھی اسی کا تتبع کیا۔ اور آج بھی جو کتابیں ہندوستان کے متعلق لکھی جاتی ہیں۔ ان میں اسی اسقفی تعلیم کا تتبع کیا جاتا ہے۔ اور ان میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ آریا لوگ ہندوستان میں «اندازاً ڈہائی ہزار مسیح سے بیشتر» داخل ہوئے تھے۔ حالانکہ جس طرح اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ نوح کا طوفان ۲۲۴۹ سال مسیح سے بیشتر آیا تھا۔ اسی طرح اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔ کہ آریا لوگ ہندوستان میں ۲۵۰۰ سال مسیح سے قبل داخل ہوئے تھے۔

جب اہل مغرب نے ہندوستان میں آکر اپنا کام شروع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں ایک ایسا سنہ جاری ہے۔ جو پانچ ہزار سال کے قریب پہونچ گیا ہے۔ اور جس کی ابتدا مسیح سے ۳۱۰۱ سال قبل ہوئی تھی۔ (اس سنہ کا نام کلجگ تھا۔ از روئے روایات ہند یہ سنہ جنگ مہابھارت کے بعد شروع ہوا تھا۔) یہ دیکھتے ہی انھوں نے حکم لگا دیا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اور ان لوگوں نے تقویم ہند کی «تصحیح» کا فرض انجام دینا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہندوستان کی ہزارہا سال کی تقویم کو مختصر کر کے صدیوں میں تبدیل کر دیا۔ اگر ان لوگوں کو مصر و بابل کی قدیم تاریخ کا کچھ بھی حال معلوم ہوتا تو غالباً وہ زیادہ احتیاط سے کام لیتے اور اسقدر بیدردی سے ہندوستانی عہد تاریخ کو مختصر نہ کر دیتے۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ شہر اور کلدانی میں پرانی قبریں برآمد ہوئی تھیں جن کی نسبت یہ راے قائم کی گئی۔ کہ وہ ولادت مسیح سے ۳۱۰۰ برس پہلے کی ہیں۔ اور ان قبروں کے نیچے سیکڑوں برس پرانی ایک اور تہ ہے اس وقت کسی نے نہ کہا کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ اس طرح

یہ طوفان نوح سے پہلے کی قبریں ثابت ہوتی ہیں۔

دانشمندان ہند تاریخ ماضی کو چند صدی نہیں بلکہ ہزارہا سال پیشتر سے دیکھتے تھے۔ اور انھوں نے نہایت غور و خوض سے کام لے کر آفرینش انسان بلکہ آفرینش کائنات کی مدت کا بھی تعین کر لیا تھا جسے وہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں سال کے پیمانہ سے ناپتے تھے۔ ان کے نزدیک کائنات زمان و مکان کے اعتبار سے غیر محدود تھی۔

اسقدر وسیع حساب کے لئے قدماء ہند کے پاس ایک خاص طریقہ تھا جسے اہل مغرب نے ان سے حال ہی میں حاصل کیا ہے۔ یورپ میں پہلے ... رومی ہندسے رائج تھے، جن کے بجائے اب "عربی ہندسے" جاری ہوئے ہیں۔ درحقیقت یہ ہندسے "عربی" نہیں بلکہ "ہندی" ہیں۔ اور انھیں پالی یا سنسکرت ناموں کے حروف ابتدائی سے اخذ کیا گیا تھا۔ ان قدیم آریوں کی وسعت خیال کا اندازہ اس بات سے ہو سکے گا۔ کہ بدھ مت والوں کی مقدس کتاب "ابھیدھما" میں پہلے بڑے عدد کو "لاکشا" لکھا گیا ہے جس سے جدید ہندوستانی لفظ "لاکھ" نکلا ہے۔ اس کے بعد دوسرے عدد کو "کوٹی" لکھا ہے جو اس زمانہ کا "کرور" ہے "کوٹی" سے اوپر جس قدر اعداد آتے ہیں، وہ سابقہ عدد سے ایک کرور گنا بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ گویا وہ کرور کے عدد کا مربع ..... وغیرہ ہیں۔ ایک کروڑ کے بیسویں درجہ تک جتنے اعداد آتے ہیں ان سب کے نئے علیحدہ علیحدہ نام رکھے گئے ہیں۔ آخری عدد وہ ہیں جس میں ایک سو چالیس صفر آتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے ماہرین فلکیات نے جو زبردست فاصلے ستاروں اور سیاروں وغیرہ کے متعلق معلوم کئے ہیں وہ قدیم سنسکرت کے ہندسوں میں بآسانی درج کئے جا سکتے ہیں۔ ہم دس کرور نوری سال کو جس سے فی الحال کائنات کی وسعت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستانی ہندسوں میں بہ آسانی ظاہر کر سکتے ہیں۔ اور پھر بھی ہندوستان کے بہت سے اعداد بیکار رہ جائیں گے۔

آریا قوم کے ریاضی دانوں کے لئے یہ بڑے بڑے اعداد کوئی تفریحی مشغلہ نہیں تھے۔ بلکہ مکان و زمان کی نسبت جو ان لوگوں کا خیال تھا۔ یہ اس کی پیمایش کے گز تھے۔ مثلاً پیدائش انسان کے لئے انھوں نے اسقدر وسیع زمانہ مقرر کیا تھا۔ کہ اب سے دس بیس سال پیشتر مغرب کے سائنسدان اس کو اسی طرح غلط کہہ بیٹھتے جس طرح پرانے سنسکرت دان مستشرقین نے خاتمۂ جنگ مہا بھارت کی بالکل معقول تاریخ (۳۱۰۲ء قبل مسیح) کو غلط قرار دیدیا تھا۔

مگر اب مغربی ماہرین حیاتیات کسی قدر دلیر ہوتے جاتے ہیں۔ تقریباً پندرہ سال گذرے کہ سر آرتھر کیتھ نے قدامت بشر پر اپنی نفیس کتاب ان الفاظ پر ختم کی کہ انھیں کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی جن کی بنا پر انسان کا وجود دنیا میں چالیس پچاس لاکھ سال پیشتر نہ مانا جائے۔ اور ابھی دو تین سال گذرے ہیں کہ ہنری فیر فیلڈ اوسبرن نے آفرینش انسان کی تاریخ ایک کروڑ ساٹھ سال معین کی ہے۔

کوئی چالیس پچاس سال پیشتر ہندوستان میں برہمنوں کا لگایا ہوا حساب شایع ہوا تھا جس میں موجودہ عالم انسانی کی تخلیق ایک کروڑ اسی لاکھ برس بتائی گئی تھی

علم طبقات الارض کے ماہرین نے زمانہ کی پہلی چار بڑی تقسیمیں کی ہیں۔ اور پھر ان کو چار چار تحتی تقسیموں میں منقسم کیا ہے۔ جس سے کائنات کی آفرینش کرور دں سال سے زیادہ قرار پائی ہے۔

لیکن غالباً یہ امر حیرت سے سنا جائے گا۔ کہ قدیم ہندوستان میں بھی اسی سے ملتا جلتا ایک نظام قائم تھا جو "کلپوں" اور "جگوں" پر مشتمل تھا۔ اور پھر ان کی بھی چار چار میں تقسیم کی گئی تھی۔ مثلاً ایک جگ کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اور یہ چاروں حصے مل کر ۴۳ لاکھ ۲۰ ہزار سال کی مدت ہوتے ہیں۔ جسے ایک "مہا جگ" کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ تو گویا زمانہ کی ابتدا ہے۔ کیونکہ ایسے ایسے دو ہزار مہا جگوں سے مل کر ایک "کلپ" بنتا ہے۔ جو گویا ۸ ارب ۶۴ کروڑ سال کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ وسیع زمانہ بھی برہما کا ایک دن اور ایک رات ہے۔ اور برہما کی عمر ایسے ایسے دنوں اور راتوں کے سو سال کے برابر ہوتی ہے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ آریوں کے ان زمانوں کی بنیاد طبقات الارض پر قائم ہے یا جوتش پر۔ لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ ان کی بنیاد طبقات الارض پر رکھی گئی ہے۔ قدیم آریوں نے اوتاروں (یعنی مدارج ارتقا) کا ایک سلسلہ قائم کیا تھا ان کے یہاں ایک اوتار "مچھ اوتار" (مچھلی) دوسرا اوتار "کشیپ اوتار" (کچھوا) نرسنگھ اوتار" (آدمی اور شیر) وغیرہ ہیں۔ اس کے بعد آدمی کی صورت میں اوتار ہوئے۔ اس سلسلہ سے ... ظاہر ہوتا ہے کہ ذوی الحیات نے کس طرح مدارج ارتقا طے کئے۔ اوّل مچھلی ہے، پھر پانی کے دوسرے جانور ہیں، پھر جانوران شیر دار ہیں پھر انسان ہے۔

(۳)

مغرب میں کائنات کی وسعت اور زمانہ کا خیال تیس پینتیس سال قبل بکوریل اور میڈم کیوری کے اکتشافات سے شروع ہوتا ہے۔ جب ریڈیو کی سرگرمی کے واقعات مسلم ہو گئے تو ماہرین طبقات الارض کو معلوم ہوا۔ کہ کائنات کی عمر کا حساب ان واقعات سے لگانا بہت ممکن ہے۔ اس طرح وہ ماہرین طبقات الارض جو ریڈیو کے اعمال کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ زمین کے بعض طبقات کی عمر دس ارب بلکہ سولہ ارب سال تک ہو سکتی ہے۔ اور یہ وہ عہد و قرون ہیں جو قدیم آریہ لوگوں کے "جگوں" اور "کلپوں" کے مطابق ہوتے ہیں۔ ریڈیو کے ایک اور ماہر فریڈرک ساڈی نے یہ بیان کیا ہے کہ ریڈیو کی گرمی کسی دن حرارت سے تمام زمین کو پگھلا دیگی۔ اور وہ منور گیس کا گولہ بن جائے گی ہو سکتا جو تی کا خیال ہے کہ ایسا بارہا ہو چکا ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کا پھر اعادہ نہ ہو۔ ایک ایسی دنیا کے اندر حرارتی طاقتوں کا جمع ہو جاتا، جس میں ایسے حدوث پذیر عناصر موجود ہیں۔ یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ کسی دن ضرور وہ پھر مشتعل ہو کر منور حالت میں آجائے گی اور تغیر و تبدل کا یہ دور اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک عناصر مذکور بالکل فنا نہ ہو جائیں۔ لیکن ابھی یہ "قیامت" اربوں بلکہ پدموں برس دور ہے۔ ساڈی کا قول ہے کہ زمانہ تکوین میں عہد طبقاتی اور عہد تنویری اسی طرح یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ جیسے رات کے بعد دن آتا ہے۔ کیا یہ خیال وہی نہیں جو قدیم آریوں نے برہما کے شب و روز کے

متعلق ظاہر کیا تھا؟

وقتی قیامت کی تصویر بھی قدیم وجدید سائنس میں یکساں ہے۔ مثلاً بدھ مت کی کتاب "شودھی مارگ" میں لکھا ہے کہ جب آگ کے ذریعہ سے دنیا کی عمر تمام ہوتی ہے تو پہاڑ نیست ونابود ہوکر آسمان میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور یہ آگ اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک دنیا میں ایک چیز بھی باقی رہتی ہے۔ لیکن جب سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں تو یہ آگ راکھ یا خاک چھوڑے بغیر اسی طرح فرو ہو جاتی ہے۔ جیسے تیل کی آگ، او فضائے بسیط کے علوی وسفلی طبقات ایک ہو جاتے ہیں، اور کامل تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ چیز جسے "دنیا" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر منجمد ہونا شروع ہوتی ہے۔ اوّل اوّل ایک ابر سا چھا جاتا ہے۔ جو کچھ عرصہ بعد نہایت باریک تہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر یہ تہ پھیل کے پانی بنجاتی ہے۔ اس کے بعد ایک ہوا چلتی ہے۔ جو پانی کو ایک تختہ بنا دیتی ہے۔ جو قطرۂ آب کی طرح گول بنجاتا ہے۔ بعد ازاں یہ گول اور آبی چیز منجمد ہونا شروع ہوتی ہے۔ اور دنیا ہمیشہ اسی تکوینی چکر میں رہتی ہے۔

بدھ مت کی مذہبی کتاب میں خود بدھ کا ایک قول ہے۔ جس میں ایک جگہ "دس کھرب دنیائیں" لکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قدیم آریاؤں نے یہ اعداد وشمار کہاں سے حاصل کئے؟ کیا تاروں بھری رات میں آسمان کی طرف دیکھ کر؟ مگر فلکیات کے متعلق جو اس زمانہ کی کتابیں ہیں ان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ رات ... صاف ہو تو انسان کو صرف پانچہزار کے قریب تارے نظر آسکتے ہیں۔ ممکن ہے مصر وعرب کے ریگستان میں آسمانوں کا قدیم مشاہدہ کرنے والے اس سے دُگنی تعداد ستاروں کی دیکھ سکتے ہوں۔

لیکن دس ہزار اور دس کھرب میں تو زمین وآسمان کا فرق ہے۔ پھر ان قدیم مشاہدہ کرنے والوں کو کیونکر معلوم ہوا کہ آسمان میں منور بادل کا جو ایک بند (کہکشاں) نظر آتا ہے وہ دنیاؤں سے بنا ہوا ہے؟ ہم نے جو کچھ معلوم کیا وہ بڑی بڑی دوربینوں کے ذریعہ سے معلوم کیا۔ مگر ہم سے دو ہزار برس بیشتر قدیم آریاؤں کو عریاں آنکھوں سے کیونکر معلوم ہو گیا تھا؟ مہابھارت میں لکھا ہے کہ:-

"اگرچہ فاصلہ کی وجہ سے ستارے ہم کو چھوٹے نظر آتے ہیں۔ مگر در حقیقت وہ بہت بڑے ہیں"

اس سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مکان وزمان کے متعلق ہم کو اس وقت جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ نئی بات نہیں بلکہ بہت پرانی بات ہے۔ مرکز ارضی والی شش ہزار سالہ دنیا گویا پرانی وسعت خیال کا ایک زمانۂ انحطاط تھا۔ جو ختم ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس سکڑی ہوئی دنیا کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ لیکن زمانہ کی وسعت کے متعلق اہل مغرب بہت عرصہ تک غلطی میں مبتلا رہے۔ اور اب ڈیڑھ سو برس کے بعد ان کے خیال کی رسائی اس حد تک پہونچی ہے۔ جہاں ہزار ہا سال پیشتر قدیم آریوں کے خیالات پہونچ چکے تھے یعنی ۱۹۲۷ء میں ماہرین حیاتیات کو یہ توفیق نصیب ہوئی کہ

وہ قدامت انسان کی مدت کا تعین اسقدر کر سکیں جو ہزار ہا سال بیشتر برہمن لوگ کر چکے تھے۔

(۴)

پھر جب اہل مغرب ... ہزار ہا سال بیشتر آریا مفکرین وہ باتیں معلوم کر چکے تھے جو اب سے ڈیڑھ سو سال قبل اہل مغرب کے نزدیک ناقابل قبول تھیں، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کی کتب قدیمہ میں فرہنگ و دانش کے اور بہت سے خزانے بھرے ہوں۔ اور وہ ایسی باتیں ہوں جہاں ہماری فکر کی رسائی ابھی نہ ہوئی ہو۔

کم از کم ایک مسئلہ تو ان کے یہاں کا ضرور ایسا ہے۔ جو اس سلسلہ میں قابل غور ہے اور وہ (Continuity … Consciousness) تسلسل شعور کا ہے مغربی ماہرین طبقات الارض و حیاتیات کے سامنے ہمیشہ یہ پیچیدہ مسئلہ رہتا ہے کہ ہمارے کرۂ ارض پر زندگی کی ابتدا کب سے ہوئی۔ ایک شخص نے تو پریشان ہو کر یہاں تک کہدیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذوی الارواح کے جراثیم کسی شہاب ثاقب پر چمٹے ہوئے دنیا پر آگرے ہونگے۔ مگر قدیم آریاؤں نے اس مسئلہ کا نہایت نفاست سے حل کر دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کی کوئی ابتدا ہی نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ مادہ جو مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ اور جن سے زندگی کے وجود کا اظہار ہوتا ہے۔ ان صورتوں کی بیشک ابتدا و انتہا ہوتی ہے یہی خیال شعور کا ہے۔ شعور بحالت مستور، جو ابھی تک ہمارے فہم و ادراک سے باہر ہے، ہمیشہ سے ہے۔ اس کی وسعت بھی لانہایت ہے۔ بس "جیو"، جو جو" جون یا چولے" بدلتا ہے انھیں کی ابتدا و انتہا ہوتی ہے۔ قدیم آریاؤں کے مطابق اسی طریقے سے ہماری نجات ہوتی ہے اور اسی طریقہ سے ہم کو بقا حاصل ہوتی ہے۔ ہم کو اپنی فطرت بتدریج شعور ابتدائی کے مطابق کرنا چاہیے۔ اور اسی شعور ابتدائی کے اندر ابدیت، دانش و فرہنگ اور خوشی و مسرت شامل ہیں۔

اس طرح گویا نیکی جس چیز کو کہتے ہیں وہ دانش کی ایک وضع یا صورت ہے۔ اور اس کے معنی ہیں عقلمندی سے اپنے اعمال و خیالات کو "حقیقت الحقائق"، ([illegible]) سے مطابق کرنا۔ یہ اوپنشد کی تعلیم ہے۔

شعور کے اس وسیع تصور کی بعض مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارا ذاتی شعور یعنی ہمارے موجودہ اجسام کا شعور ازلی و ابدی نہیں ہے۔ بلکہ وہ عظیم شعور ازلی لافانی ہے۔ وہ بحر بے پایاں جس میں سے ہم نے اپنی زندگی کا قطرہ حاصل کیا۔ اور جس میں جا کر ہماری زندگی کا دریا پھر شامل ہو جائے گا۔ وہیں سے ہم آئے تھے۔ اور وہیں ہم جا پہونچیں گے۔ با اینہمہ ہمارے ذاتی شعور میں بھی ازلیت و ابدیت کا ایک تخم موجود ہے۔ اور یہی وہ جوہر ہے۔ جو ہمارے فہم و ادراک کو اکسا کر "عہد طبقاتی"، کی وسیع گہرائیوں کی تھاہ لگانے اور مستقبل کے راز معلوم کرنے بھیجتا ہے۔ ایک مادہ پرست ماہر طبقات کے نزدیک ہماری زندگی اور ہمارے شعور کی ابتدا ازجوہر حیات کے ایک باریک ذرہ میں ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاربن آکسیجن، اور نائٹروجن کے ایک ذرہ میں ازلیت و ابدیت کا فوری احساس کہاں سے آیا؟ تاوقتیکہ اس میں شعور کا مادہ بھی نہ ہو۔ یعنی شعور ابتدائی یا ازلی کا ایک ننھا سا شعلہ۔ یہی وہ ازلیت و

ابدیت شعور کی ہے - جو ہم نے ماضی کی وسیع تاریکیوں کی پیمایش کراتی ہے - ورنہ وہ کون سی چیز ہے جو ہم کو ماضی کا یقین دلا سکتی ہے - ایک ماہر طبقات الارض سمندر کے کنارہ کسی پہاڑی پر کھڑا ہوا اس کے مختلف طبقات کو "آج" دیکھ رہا ہے مگر اس کے اندر جو عقل خدا داد ہے وہ اس "اب" کے معنی ہزاروں لاکھوں سال بتاتی ہے جس میں قرنہا قرن تک سمندر نے کام کرتے کرتے چھوٹے چھوٹے بحری جانوروں کی استخوانوں کی تہیں جما دی تھیں۔

نیاز

"تذکرہ جمیل"

(اردو شاعرات کا تذکرہ)

میں نے اُردو شاعرات کا تذکرہ مرتب کیا ہے - جس کی ادب اُردو میں بہت سخت ضرورت تھی - چنانچہ چندہ اولین شاعرہ سے لے کر ۱۸۹۹ء تک کل شاعرات کا تذکرہ جمع کر لیا گیا ہے - اور کتابت ہو رہی ہے - اب میں ناظرات سے بصد ادب درخواست کرتا ہوں کہ وہ دور حاضرہ کی شاعرات (۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۱ء) کے حالات و نمونے شاعری کے مجھے سرفراز فرمائیں - تاکہ یہ تذکرہ کسی حد تک مکمل ہو سکے - کتاب کی اشاعت کی عجلت ہے - اس لئے قوی اُمید ہے - کہ ۲۵ / اکتوبر ۱۹۳۱ء تک مجھکو شاعرات اپنے حالات اور اپنے نمونہ کلام سے مطلع فرمائینگی

قادری محمد مشیر احمد علوی ناظر بی - اے (علیگ)
ٹرسٹ وائس پریسیڈنٹ - انجمن معیار الادب -
اورئنٹیل پبلشنگ ہاؤس ۳ امین آباد پارک - لکھنؤ -

فراست التحریر مکمل

یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن، مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اُردو میں بالکل پہلی کتاب، اردو حصہ علاوہ محصول ۸ / انگریزی حصہ علاوہ محصول ۸ / ہر دو حصے مع محصول عہ /

منیجر نگار لکھنؤ

عمرِ برق خرام

اگر کوئی شخص خوش قسمت ہو تو ایسا جیسے ہمارے دوست پروفیسر جبرن ہیں کہ ہاتھ ڈالیں مٹی پر تو بجائے سونا ہو جائے۔ یوں تو ہم نے اکثر محققین کا حال سنا ہے۔ جنھوں نے دنیا میں بڑے بڑے نمایاں کام۔۔ کیے ہیں، مگر جو کارنامہ ہمارے دوست کا ہے۔ اس کی نظیر کہیں ملتی ہی نہیں۔ انھوں نے ایک ایسی چیز دریافت کی ہے جس سے حیاتِ انسانی میں انقلابِ عظیم پیدا ہو جائے گا۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ چیز ان کو اتفاق سے اس وقت حاصل ہو گئی جبکہ ان کا ارادہ محض ایک مقوی اعصاب نسخہ تجویز کرنے کا تھا۔

——— میرا گھر فاکسٹون میں ہے۔ اور پروفیسر جبرن صاحب میرے ہمسایہ ہیں۔

تقریباً سال بھر کا عرصہ گذرا کہ مجھ سے پروفیسر صاحب کی ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے کہ "میں ابھی ان چھوٹی چھوٹی ایجادوں سے ہرگز مطمئن نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ ادویہ یا تو اعصاب پر اثر کیے بغیر مرکزی طاقت کو بڑھا دیتی ہیں یا وہ نظامِ عصبی کے مادۂ موصلیت (Conductivity) کو کم کر کے جسم کی بچی ہوئی طاقت کو بڑھا دیتی ہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر معدہ اور قلب کے فعل کو تقویت دیتی ہے۔ تو دماغ کو مختل چھوڑ دیتی ہے یا اگر بیش قیمت شراب کی طرح دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ دیگر اعضائے رئیسہ کو چھوڑ دیتی ہے۔ مگر میں کچھ ایسی چیز چاہتا ہوں۔ جو تمام اعضا پر اثر ڈالے۔ اور ایسا معلوم ہو گویا آپ میں دو تین آدمیوں کی طاقت آ گئی ہے۔

میں:۔ لیکن ایسی دوا تو انسان کو تھکا کر اور کمزور کر دے گی۔

پروفیسر۔ قطعی نہیں۔ بلکہ اس کے استعمال کے بعد آپ دو چند، سہ چند غذا کھائیں گے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ یہ چیز کیسی ہوگی۔ (ایک سبز شیشی اپنی جیب میں سے نکال کر) ایسی ہوگی۔ اور اس بیش بہا شیشی کے اندر وہ طاقت ہوگی۔ کہ اس کے استعمال کرنے سے آپ دوگنا سوچیں گے۔ دوگنی تیزی سے حرکت کریں گے۔ اور ایک مقررہ وقت میں اوروں سے دوگنا کام کریں گے۔"

میں۔ مگر ایسی چیز ممکن بھی ہے؟

پروفیسر - میرے خیال میں ضرور ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اپنا ایک سال اس فکر میں کیوں ضائع کرتا۔ مثلاً ہائپو فاسفیٹ کے مختلف مرکبات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور تیار کی جا سکتی ہے۔ دوگنی نہیں اگر ڈیوڑھی قوت کی بھی دوا تیار ہو گئی تو ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔

میں - مقصد پورا ہو جائے گا؟ کیونکر

پروفیسر - فرض کیجئے کہ آپ ایک سیاست داں اور مدبر ہیں - آپ کا وقت گذرا جا رہا ہے - اور کام ابھی تک نہیں ہوا اور وہ کام بہت ضروری ہے - تو ایسی حالت میں کیا ہونا چاہئے؟

میں - پرائیوٹ سکرٹیری کو دوا کی ایک خوراک دیدینی چاہیئے۔

پروفیسر - اور اس طرح دو چند کام لینا چاہئے - اور غور کیجئے مثلاً آپ کوئی کتاب ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر ہے، جس پر سکرات موت طاری ہیں، اور وہ چاہتا ہے کہ اٹھ بیٹھے - اور کسی مریض کے معاملہ میں غور کرے یا کوئی بیرسٹر ہے۔ یا کوئی ایسا شخص ہے جو امتحان دینے کے لیے کتابوں کا کیڑا بنا ہوا ہے۔

میں - ایسے لوگوں کے لئے آپ کی دوا یقیناً بڑی بیش قیمت چیز ہوگی۔

پروفیسر - یا کوئی جنگ ہو رہی . . . . ہے جس میں کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ جلد سے جلد پستول کی لبلبی دبائی جائے۔

میں - یا پٹہ بازی - یا پھری گدکا ہے۔

پروفیسر - الغرض اگر میں کوئی ایسی دوا ایجاد کر لوں تو اس میں سوائے اس کے اور کوئی نقصان ہوگا، کہ آپ ایک نہایت خفیف حد تک بڑھاپے کے قریب ہو جائیں گے - لیکن آپ کی زندگی اور دن کے مقابلہ میں دو چند ہو جائیگی

میں - کیا واقعی آپ کے خیال میں ایسی دوا ایجاد ہو سکتی ہے؟

پروفیسر صاحب نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا - اور پھر اس سبز شیشی سے اپنی میز کا کنارہ کھٹ کھٹا کر بولے:- میں خیال کرتا ہوں کہ میں یہ دوا معلوم کر چکا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ اس کے بعد بھی اس دوا کے متعلق ہم دونوں میں کئی بار گفتگو ہوئی۔ اور جب کبھی وہ اس کے متعلق گفتگو کرتے تھے۔ ان کے لب و لہجہ سے بہت زیادہ یقین ظاہر ہوتا تھا۔ دنیائے حیات میں اس جدید دوا کے استعمال سے جو غیر متوقع نتائج پیدا ہونے والے تھے۔ ان کی نسبت گفتگو کرتے ہوئے وہ کبھی کبھی گھبرا جاتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ ملول و حزیں نظر آنے لگتے تھے۔ اور کبھی کبھی وہ اس بارہ میں بھی گفتگو کرنے لگتے تھے۔ کہ اس دوا کی ایجاد سے کس قدر منافع حاصل ہو سکے گا، اکثر ایسا ہوا کہ ہم دونوں اس بات پر طویل بحث کرتے رہے کہ تجارتی طور پر اس عجیب دوا سے کیونکر فائدہ حاصل کیا جائے۔

وقت گذر گیا مگر مجھے جو دلچسپی اس ستم ایجاد دوا سے پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بدستور قائم رہی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی پروفیسر جبیرن کوئی ایسی چیز تیار کر رہے ہیں۔ جس سے انسان کی زندگی پر بڑا اثر پڑے گا۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص نے اس دوا کو بار بار استعمال کیا۔ تو اس میں شک نہیں۔ کہ اس کی زندگی نہایت سرگرمی سے گزرے گی۔ لیکن گیارہ ہی برس کی عمر میں وہ جوان، بچیس برس کی عمر میں ادھیڑ، اور تیس برس کی لگ بھگ...... اس کا انحطاط شروع ہو جائے گا۔

اگست کے مہینہ کی سات تاریخ ہوگی یا آٹھ کہ پروفیسر صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ کچھ عرصہ سے دوا تیار کر رہے ہیں۔ اور اسی پر ان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے۔ ۱۰ اگست کو جوان سے میری ملاقات ہوئی تو وہ فرمانے لگے۔ کہ اب "جدید اکسیر حیات"، کا مادی وجود دنیا میں آگیا ہے۔ جس روز پروفیسر صاحب سے میری یہ ملاقات ہوئی۔ اس روز میں غالباً کسی کام سے فاکسٹون کی طرف جا رہا تھا۔ دیکھ کر جھپٹتے ہوئے آئے۔ میرے خیال میں شاید وہ مجھ سے اپنی کامیابی کا حال بیان کرنے میرے گھر آ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ آج ان کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن تھیں۔ ان کے چہرے پر سُرخی دوڑ رہی تھی۔ اور ان کی رفتار میں تیزی اور لچک بھی تھی۔ پروفیسر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جلدی سے بولے:۔ ہو گیا جناب کام ہو گیا۔ بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ ہو گیا۔ آپ میرے یہاں تشریف لائیں۔ اور دیکھیں۔

میں۔ واقعی ؟

پروفیسر۔ جی ہاں واقعی۔ آپ میرے یہاں تشریف لائیں۔ اور دیکھیں۔

میں۔ اور وہ اسی طرح دوچند کام کرتی ہے ؟

پروفیسر۔ اس سے بھی زیادہ بلکہ بہت زیادہ۔ میں تو اس دوا کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ آئیے اور خود اس دوا کو ملاحظہ فرمائیے بلکہ خود چکھ کر اس کا تجربہ کیجیے۔ دُنیا میں اس سے زیادہ حیرت انگیز چیز کوئی نہ ہوگی۔

پروفیسر صاحب نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اور مجھے پہاڑی کی طرف لے چلے۔ موسم بہت صاف اور روشن تھا۔ ہر چیز چمکدار۔ اور منوّر نظر آ رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہوا کسی قدر تیز چل رہی تھی۔ جس سے میرا جسم کسی قدر ٹھنڈا اور پسینہ خشک ہو رہا تھا۔ میں نے شور مچایا کہ "پروفیسر صاحب خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ رحم"۔ اس پر پروفیسر صاحب نے اپنی رفتار کسی قدر دھیمی کر دی۔

پروفیسر۔ میں تیز کہاں چل رہا ہوں۔

میں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے وہ دوا کسی قدر پی لی ہے۔

پروفیسر۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔ مگر ہاں یہ ضرور ہوا کہ جس گلاس میں سے دوا کے چند قطرے باقی تھے۔ اس کو دھونے کے بعد پانی کا ایک قطرہ میں نے ضرور چکھ لیا تھا۔ ہاں بیشک کل رات میں نے وہ دوا ضرور چکھی تھی۔ مگر اب تو وہ پُرانی بات ہو گئی۔

میں - اور اس کا اثر بھی دوگنا ہے ؟

پروفیسر - اجی دوگنا کیسا ہزار گنا کہئے - ہزار گنا

اب ہم پروفیسر صاحب کے مکان پر پہونچ گئے - اور انھوں نے پرانی وضع کا لکڑی کا پھاٹک کھولا - میں بھی ساتھ ہی اندر داخل ہوا - اور انھوں نے فرمایا میں نہیں کہہ سکتا اس میں کتنا زبردست اثر ہے - اس کے پیتے ہی نظام عصبی کے علم پر عجیب قسم کی روشنی پڑنے لگتی ہے - نظریہ رویا کو وہ ایک جدید صورت میں پیش کرتی ہے . . . . . . خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے ہزار گنا . . . . خیر یہ باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی - فی الحال اس دوا کا امتحان کرنا ہے

میں - دوا کا امتحان کرنا ؟

اب ہم پروفیسر صاحب کی نشستگاہ میں پہونچ گئے - اور پروفیسر صاحب نے فرمایا

پروفیسر - جی ہاں - وہ دیکھئے اس سبز شیشی میں وہ دوا موجود ہے - بشرطیکہ آپ ڈریں نہیں

میں فطرتاً بہت محتاط آدمی ہوں - کسی معاملہ میں بغیر سوچے سمجھے ہاتھ نہیں ڈالتا - میں خود ڈرتا تھا - مگر دوسری طرف کسی قدر اپنی شان کا بھی خیال تھا - بالآخر میں نے کہا - آپ تو فرماتے ہیں کہ میں اس کا امتحان کر چکا ہوں

ہاں میں نے اسے ضرور چکھا ہے - اور مجھے اس سے کوئی نقصان نہیں پہونچا - آپ خود دیکھ سکتے ہیں - کہ مجھ کوئی نقصان پہونچا ہے ؟

میں - (کرسی پر بیٹھ کر) اچھا تو لائیے مجھے بھی وہ دوا دیجئے

میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور پروفیسر صاحب اپنی میز کے آگے کھڑے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے - ان کے چہرہ سے اس وقت فخر و ناز ٹپک رہا تھا - اور وہ اپنے آپ کو ایک بہت بڑا ماہر طب سمجھتے تھے -

پروفیسر - دیکھئے یہ عنابی رنگ کی دوا ہے - مگر میں آپ کو ایک بات سمجھائے دیتا ہوں - اور وہ یہ کہ جونہی یہ دوا آپ کے حلق سے نیچے اترے آپ فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں - اور پھر اطمینان کے ساتھ ایک دو منٹ میں آپ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں - کیونکہ پتلی کو ایک قسم کی تکلیف ہوتی ہے - اور آنکھیں کھولنے کے وقت چکر سا آنے لگتا ہے - اس لئے آپ آنکھیں بند رکھیں - "

میں - آنکھیں بند رکھوں ؟ خوب !

پروفیسر - اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ بالکل ساکت رہیں - کسی قسم کی حرکت نہ کریں - کیونکہ آپ یہ دوا پینے کے بعد کئی ہزار گنا تیز ہو جائیں گے - آپ کا دل، دماغ، پھیپھڑے اور عضلات وغیرہ ہر چیز ہزاروں گنا تیز کام کرے گی - اور آپ کو صرف اسقدر محسوس ہوگا - کہ دنیا بمقابلہ بیشتر کے ہزاروں گنا سست رفتار سے چل رہی ہے - بس یہی اس دوا میں عجیب و غریب اثر ہے -

میں۔ اللہ اللہ! کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
پروفیسر۔ مطلب وطلب کچھ نہیں۔ بس آپ خود دیکھ لیں۔
یہ کہہ کر پروفیسر نے ایک چھوٹا سا پیمانہ اٹھایا۔ میز پر جو چیزیں رکھی تھیں۔ ان کی طرف دیکھا اور بولے :"گلاس بھی ہیں۔ پانی بھی ہے۔ سب چیزیں یہیں موجود ہیں۔ لیکن پہلی مرتبہ زیادہ مقدار میں نہ پینا چاہئے"۔
چھوٹی سی شیشی نے "قلقل" سے کمرہ کی فضا میں ترنم پیدا کیا۔ اور پیمانہ میں ایک سرخ سرخ سی چیز نظر آنے لگی۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے وہ پیمانہ ایک گلاس میں خالی کر دیا۔ اور فرمایا:۔
"جو کچھ میں نے سمجھا دیا ہے وہ ہرگز نہ بھولنا۔ اپنی آنکھیں خوب کس کر بند کر لو۔ اور دو منٹ تک بالکل بے حس و حرکت اور ساکت بیٹھو۔ پھر آپ مجھے بولتے سنیں گے۔"
اس کے بعد پروفیسر صاحب نے دونوں گلاسوں میں ایک ایک انچ کے قریب پانی ڈالا۔ اور فرمایا:۔
ہاں اتنی بات اور بھی سن لیجئے۔ یعنی اپنا گلاس نیچے نہ رکھیں۔ ہاتھ میں لئے رہیں۔ اور اپنا ہاتھ زانو پر رکھ لیں ہاں۔ ہاں۔ اس طرح۔ اور اب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
پروفیسر صاحب نے اپنا گلاس اٹھایا۔ اور ادھر میں نے اپنا گلاس ہاتھ میں لے کر کہا:۔

"جدید اکسیر حیات"

اس کے بعد ہم دونوں نے اپنے گلاس ایک دوسرے کے گلاس سے ٹکرائے اور پی لئے۔ اور میں نے اپنی آنکھیں فوراً بند کر لیں۔ پروفیسر صاحب نے بھی میرے الفاظ دہرائے۔
جس طرح کوئی شخص گیس سونگھنے کے بعد دنیا و مافیہا سے قطعی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری حالت بھی نہ معلوم کتنی دیر تک یوں ہی رہی۔ اس کے بعد میں نے پروفیسر جیبرن کی آواز سنی جو مجھ سے بیدار ہونے کو کہہ رہے تھے۔ میں نے بھی ہاتھ پاؤں ہلائے۔ اور آنکھیں کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ پروفیسر صاحب ہاتھ میں گلاس لئے ہوئے۔ وہیں کھڑے ہیں۔ جہاں وہ پیشتر سے کھڑے ہوئے تھے۔ فرق صرف اسقدر تھا کہ اس وقت ان کا گلاس خالی تھا۔
میں۔ کیسے جناب کیا حال ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پروفیسر۔ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔
میں۔ کوئی بات نہیں؟ کچھ تو ہو گا۔ کم از کم یہ تو محسوس ہوتا ہو گا۔ کہ سانسیں ٹھنڈی آ رہی ہیں۔
پروفیسر۔ کچھ آوازیں سنتے ہو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں۔ بالکل سکوت طاری ہے۔ خدا کی قسم ہر چیز ساکت ہے۔ ہاں کچھ "پٹ پٹ" کی آواز آ رہی ہے۔ گویا بارش کے قطرے مختلف چیزوں پر پڑ رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟
میرا خیال ہے کہ میرے جواب میں پروفیسر صاحب نے کہا کہ "تجزیہ شدہ آوازیں ہیں" مگر مجھے ٹھیک طور پر

یاد نہیں کہ یہی کہا تھا یا کچھ اور۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور بولے:-
آپ نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے۔ کہ کسی کھڑکی میں پردہ اس طرح آویزاں ہو جس طرح سامنے لٹکا ہوا ہے؟
جس طرف وہ دیکھ رہے تھے میں نے بھی دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پردہ کا ایک سرا بہت تیزی کے ساتھ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ اور بہت پھٹا رہا ہے۔
میں - نہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بالکل عجیب بات ہے۔ پروفیسر - اور یہ بھی دیکھئے۔
یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے اپنا دہا ہاتھ کھولا جس میں گلاس تھا۔ میں سمجھا تھا کہ گلاس میز پر گر کر ٹوٹ جائیگا۔ مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کہ گر کر ٹوٹنا تو درکنار وہ گلاس حرکت کرتا بھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ ہوا میں بالکل ساکن اور معلق تھا۔
پروفیسر - ان عرض البلاد میں ہر چیز پہلے سکنڈ میں سولہ فٹ زمین کی طرف گرتی ہے۔ چنانچہ یہ گلاس بھی ۱۶ فٹ فی سکنڈ کے حساب سے گر رہا ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں۔ کہ ابھی وہ ایک سکنڈ کا ۱/۱۰ حصہ بھی نہیں گرا۔ اس سے آپ کو میرے "جدید اکسیر حیات" کی رفتار کا کچھ اندازہ ہوگیا ہوگا"
گلاس جو آہستہ آہستہ گر رہا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اس کے اوپر نیچے اور چاروں طرف اپنا ہاتھ گھمایا۔ اور بالآخر انھوں نے گلاس کا پیندا پکڑ لیا۔ اور نیچے گھسیٹ لیا۔ اور احتیاط کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر فرمایا "دیکھا" اور ہنسنے لگے۔ . . . . میں - بہت ٹھیک!
اس کے بعد میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی کرسی پر سے اٹھنا شروع کیا۔ میں اپنی حالت پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ طبیعت نہایت ہلکی اور مطمئن تھی۔ میرے تمام اعضاء میں تیزی محسوس ہوتی تھی۔ مثلاً میرا دل فی سکنڈ ایکہزار کے حساب سے دھڑک رہا تھا۔ مگر اس بات سے مجھے کوئی تکلیف یا گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بائیسکل پر سوار ہے۔ مگر کوئی حرکت نہیں کرتا۔ سر نیچے ہے اور پاؤں اوپر۔ اور بائیسکل کے پہیوں کے پیچھے گرد و غبار کا ایک بادل ہے۔ وہ ایک تیز رفتار موٹر لاری کو پکڑنا چاہتا ہے۔ جو بظاہر ساکن نظر آرہی ہے۔ میں یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر بے حد متعجب ہوا۔ اور پکار کر کہا:-
میں - جیبرن! اس ملعون دوا کا اثر کب تک باقی رہے گا . . . . پروفیسر - خدا معلوم کب تک رہے گا۔ پچھلی مرتبہ جب میں نے یہ دوا استعمال کی تھی۔ تو میں فوراً اپنے بستر پر دراز ہوگیا۔ اور سوتے سوتے اس کا اثر زائل ہوگیا تھا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ میرے دل میں کسی قدر خوف ضرور پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ میری یہ حالت چند منٹ رہی ہوگی۔ مگر وہ مجھے گھنٹوں معلوم ہوتی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد یہ حالت رفع ہونے لگی اور پھر دفعتاً ختم ہوگئی۔
مجھے اس بات پر تو ناز ہے کہ مجھ پر کسی قسم کا خوف طاری نہیں ہوا۔ ممکن ہے۔ اس کا سبب یہ ہو کہ ہم اسوقت دو آدمی تھے۔

میں - ہم اس وقت باہر کیوں نہ چلیں ؟ . . . . . . پروفیسر - بیشک چلنا چاہیئے۔

میں - اگر ہم باہر چلیں گے تو اور لوگ بھی ہماری حالت دیکھیں گے۔ . . . . پروفیسر - لوگ نہیں دیکھ سکیں گے - ہرگز نہیں دیکھ سکیں گے - جتنی دیر میں ایک شعبدہ گر مداری اپنا ہتھکنڈا کر جاتا ہے - ہم اس سے بھی ہزاروں درجہ زیادہ چلتے ہوں گے اچھا اب اٹھیے - کون سے راستہ سے چلیں - دروازے سے یا کھڑکی سے ؟

بہرحال ہم دونوں کھڑکی کی راہ سے برآمد ہوئے - اس سے قبل سیکڑوں عجیب واقعات مجھے پیش آچکے ہیں - لیکن یہ ہے - کہ آج جو مختصر سی سیر میں نے پروفیسر جیبرن کے ساتھ کی وہ سب سے زیادہ عجیب وغریب تھی - ہم دونوں پھاٹک سے نکل کر سڑک پر پہونچے - اور وہاں کے آنے جانے والوں پر غائر نظر ڈالی - کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گھوڑا گاڑی سامنے موجود ہے - پہیوں کے اوپر کا حصہ ، اور اس کے گھوڑوں کی کسی قدر ٹانگیں - گاڑیبان کے چابک کا سرا ! اور اس کا نیچے کا جبڑا (وہ اس وقت جمائی لے رہا تھا -) تو بظاہر کچھ حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے - ورنہ اس گاڑی کا بقیہ تمام حصہ ساکن نظر آتا تھا - اور لطف یہ ہے کہ کسی قسم کا شور وغل سنائی نہیں دیتا تھا - بجز اس کے کہ ایک شخص نے زور سے کھنکارا جس سے کسی قدر خفیف سی آواز پیدا ہوئی - اس وقت اس جامد و ساکن گاڑی میں ایک گاڑیبان ، ایک ڈرائیور اور گیارہ مسافر تھے - جس وقت ہم اس گاڑی کے گرد گھومے تو اول اول تو وہ منظر بہت عجیب نظر آیا - مگر بعد میں ناگوار معلوم ہونے لگا - گاڑی میں جو آدمی تھے وہ بھی اگرچہ ہمارے ہی جیسے تھے مگر پھر بھی ایسے نہ تھے - وہ اطمینان کے ساتھ جہاں بیٹھے ہوئے تھے بت معلوم ہوتے تھے - اور جو شخص کچھ حرکت کرنے لگا تھا وہ کرتا ہی رہ گیا تھا - مثلاً ایک لڑکی اور ایک مرد ایک دوسرے کی طرف مسکرائے - مگر اس طرح گویا ہمیشہ مسکراتے ہی رہیں گے - ایک عورت نے گاڑی کے جنگلہ پر ہاتھ رکھا - اور پروفیسر جیبرن کے مکان کی طرف دیکھنے لگی اور دیکھتی ہی رہ گئی - ایک شخص ... اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر چوہے کی دم کی طرح بناتا ہی رہ گیا - اسی طرح ایک شخص نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اپنی ٹوپی ٹھیک کرنا چاہی اور وہ گویا ابد الآباد تک یوں ہی رہ گیا - ہم دونوں لوگوں کی طرف دیکھتے تھے - اور ہنستے تھے - اس کے بعد ہم کو وہ لوگ کسی قدر ناگوار معلوم ہونے لگے - اس کے بعد ہم وہاں سے ہٹے اور بائیسکل سوار کے سامنے سے ہو کر پارک میں آئے - یہاں دفعتاً پروفیسر جیبرن چلا اُٹھے :-

پروفیسر - اللہ اللہ ! یہ دیکھو -

انھوں نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر اپنی انگلی سے اشارہ کیا - کیا دیکھتے ہیں - کہ ایک شہد کی مکھی آہستہ آہستہ پر پھڑپھڑاتی ہوا میں جا رہی ہے - لیکن اس کی رفتار پرواز ایک گھونگھے کی چال سے بھی کم تھی -

جب ہم پارک میں پہونچے تو وہاں کا منظر اور بھی عجیب وغریب نظر آیا - اس وقت بالائی نشست پر بینڈ باجہ بج رہا تھا - مگر اس کی آواز ہمارے نزدیک نہایت دھیمی تھی - اور بعض اوقات یہ آواز ایسی معلوم ہونے لگتی تھی - جیسے کسی بہت ہی بڑے گھنٹہ کی "ٹک ٹک" لوگ سیدھے کھڑے ہوئے - باجے کے نغموں کو خاموش سن رہے تھے - اور بعض آدمی

جو سبزہ زار پر ٹہل رہے تھے، مطمئن اور بت کی طرح ساکن دکھائی دیتے تھے، جس کا جو پاؤں جہاں اٹھ گیا بس وہیں رہ گیا تھا۔ میں ایک چھوٹے سے کتے کے پاس سے گذرا جو کودنے کے عمل میں معلق رہ گیا تھا۔ اور جب وہ زمین پر اترا تو میں نے اوس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کو آہستہ آہستہ حرکت کرتے دیکھا۔ اسی اثناء میں پروفیسر جیبرن نے کہا:۔ "ذرا! یہ تو دیکھو"۔ ہم لمحہ بھر کے لئے ایک شاندار اور وجیہہ آدمی کے سامنے ٹھہرے، جس نے منہ موڑ کر دو لیڈیوں کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا جو نہایت نفیس ریشمی لباس پہنے ہوئے تھیں۔ اس آدمی نے ان خاتونوں کی طرف آنکھ کا اشارہ کیا، لیکن ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک آنکھ ہمیشہ کے لئے نصف بند ہو کر رہ گئی ہے۔

میں۔ پروفیسر صاحب اس وقت سخت گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ ذرا آہستہ آہستہ چلئے۔

پروفیسر۔ آجی آؤ بھی۔

کرسیاں جو راستہ میں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم ان میں ہو کر گزرے۔ بہت سے آدمی اپنے قدرتی طریقہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص جس کا چہرہ سُرخی سے تمتما رہا تھا۔ اپنا اخبار تہ کرنے میں مشغول تھا اور وہ اخبار ہوا سے اڑا جا رہا تھا۔ مگر ہم کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ اپنے اس عمل میں بت کی طرح ساکن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔۔۔۔کہ ان تفریح کے شوقین لوگوں کو اس وقت بہت تیز ہوا لگ رہی ہے۔ لیکن جہاں تک ہم دونوں کے احساس کا تعلق تھا۔ وہاں تک ہوا کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ ہم وہاں سے بھی چل دیے اور لوگوں سے کسی قدر دور ہٹ گئے۔ اور پھر مڑ کر مجمع کو دیکھنے لگے۔ دیکھا کہ مجمع اس طرح جامد و ساکن بنا ہوا ہے جیسے مومی مورتیں۔ یا سطح قرطاس کی تصویریں۔ زندہ آدمیوں کا بتوں کی طرح بے حس و حرکت نظر آنا ایک حیرت انگیز بات تھی۔ جب سے وہ دوا میں نے استعمال کی تھی۔ اس وقت سے اب تک جو کچھ میں نے کہا یا جو کچھ میں نے سوچا وہ جہاں تک ان لوگوں بلکہ عموماً تمام دنیا کا تعلق تھا، سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔

"جدید اکسیر حیات"۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کہنا شروع کیا۔ لیکن پروفیسر نے میرا قطع کلام کیا۔

پروفیسر۔ ایک نہایت بیہودہ اور چڑیل سی بڑھیا ہے"۔۔۔۔۔۔۔ میں۔ کون بڑھیا؟

پروفیسر۔ اجی ایک کمبخت ہے جو میرے مکان کے برابر میں رہتی ہے۔ اس کے لابلینڈ کا ایک کتا ہے جو بُری طرح بھونکتا ہے۔ واللہ اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔"

بعض اوقات پروفیسر جیبرن کی حالت کچھ عجیب طرح کی ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ بالکل بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ میں ان کو روکتا ہی رہا۔ مگر وہ ہاتھ چھڑا کر جھپٹے اور جھپٹ کر کتے کو پکڑ لیا۔ اور آندھی کی طرح پہاڑی کی طرف دوڑے۔ یہ ایک بالکل عجیب اور غیر معمولی حرکت تھی۔ کتا بیچارہ نہ بھونکا نہ تڑپا۔ نہ چلایا۔ بلکہ اس نے ذرا سی بھی حرکت نہ کی جو ایک زندہ جانور کر سکتا ہے۔ بلکہ وہ پروفیسر کے ہاتھ میں اس طرح رہا جیسے کوئی آرام سے لیٹا ہوا ہے۔ حالانکہ پروفیسر صاحب نے اس کی گردن پکڑ رکھی تھی۔ اور وہ بالکل ایسا بے حس و حرکت اور بے جان معلوم ہوتا تھا گویا لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ میں نے چلا کر کہا:۔

میں - جیسرن! چھوڑ دو اس کتے کو - ایک تو ویسے ہی سخت گرمی ہو رہی ہے - دوسرے تم نے دوڑتے دوڑتے مار ڈالا - خدا کی پناہ اس قدر تیزی کہ دو تین میل فی سکنڈ کے رفتار سے دوڑ رہے ہو - ہوا کی رگڑ مارے ڈالتی ہے -

پروفیسر (کتے کی طرف دیکھتے ہوئے) - کیا؟ . . . . میں - ہوا کے تھپیڑے! ہوا کی رگڑ!! آپ بیحد تیز دوڑ رہے ہیں - گویا فضاء بسیط میں شہاب ثاقب ٹوٹ رہا ہے - اوہو! سخت گرمی محسوس ہو رہی ہے - اگر آپ اسی طرح دوڑتے رہیں گے تو آپ کے کپڑوں میں آگ لگ جائے گی - دیکھئے آپ کی پتلون کا کپڑا بھورا ہوتا جا رہا ہے - میں اس وقت سر سے پاؤں تک پسینہ پسینہ ہو رہا ہوں - تمام جسم میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں - وہ دیکھو مجمع میں کسی قدر حرکت شروع ہو گئی ہے - میرے خیال میں اب ہماری دوا کا اثر زائل ہونے لگا ہے - پروفیسر اس کتے کو نیچے ڈال دو -

پروفیسر - کیا؟ . . . . میں - دوا کا اثر غالباً زائل ہو رہا ہے - اس وقت سخت گرمی معلوم ہو رہی ہے - دیکھو میں پسینہ میں بھیگ گیا ہوں -

پروفیسر صاحب میری صورت کو تکنے لگے - پھر انھوں نے بینڈ باجہ کی طرف دیکھا - جو یقیناً اب زیادہ تیزی سے بج رہا تھا - اس کے بعد انھوں نے نہایت تیزی سے ہاتھ ہلا کر کتے کو پھینک دیا - جو ایک بے جان کی طرح ہوا میں اڑتا چلا گیا - اور چند آدمیوں کی جماعت جو چھتریاں لگائے ہوئے کھڑے تھے - اُن کے سروں پر معلق ہو گیا پروفیسر صاحب نے میرا بازو پکڑ لیا اور بولے :-

پروفیسر - واقعی شدت کی گرمی ہے - اور جسم میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں - دیکھو وہ آدمی اپنا رومال بار بار حرکت میں لاتا دکھائی دیتا ہے - چلو یہاں سے جلدی نکل چلو -

مگر بد قسمتی کہیے یا خوش قسمتی، ہم جلدی نہ جا سکے - کیونکہ اگر ہم دوڑتے تو ہمارے جسم میں ضرور شعلے بھڑکنے لگتے - اور ہم پیکر کاغذی کی طرح جلنے لگتے - دوا پیتے وقت ہم کو اس بات کا خیال تک نہ آیا تھا . . . . . بہر حال قبل اس کے کہ ہم دوڑنا شروع کریں اس دوا کا اثر زائل ہو گیا - بس یہ سب کچھ ایک سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں ہو گیا - اس جدید "اکسیر حیات" کا اثر اس طرح ختم ہو گیا - جیسے کوئی پردہ یک لخت اٹھ جاتا ہے - اتنے میں میں پروفیسر صاحب کی آواز سنی جو خوف زدہ اور گھبرائے ہوئے کہہ رہے تھے :- "بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ!!" آواز سنتے ہی میں فوراً زمین پر بیٹھ گیا - مگر گرمی کے مارے جھلس گیا تھا - اور جس جگہ میں بیٹھا تھا - وہاں کی گھاس اس طرح جلی کہ آج تک وہ جگہ گھاس سے خالی ہے - اب وہ جمود و سکون، جو دنیا بھر پر چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا ختم ہو گیا - تمام دُنیا و مافیہا بیدار ہو گئی بینڈ جو اب تک ہم کو بے سُرا اور بیہودہ معلوم ہوتا تھا - اب اس کی سُریلی آوازیں کانوں میں آنے لگیں - جو لوگ ساکن نظر آ رہے تھے - اب وہ چلتے ہوئے دکھائی دینے لگے - کاغذ اور جھنڈیاں پھڑ پھڑانے لگیں - لبہائے تبسم آمیز سے باتیں نکلنے لگیں - آنکھ کا اشارہ کرنے والے کا اشارہ ختم ہو گیا - اور وہ خاموش نکلا ہوا چلا گیا - اور جسقدر آدمی کرسیو

اور بچوں پر ساکت و ساکن بیٹھے ہوئے تھے - وہ حرکت اور باتیں کرنے لگے -

اب گویا تمام دنیا زندہ ہو گئی تھی - اور جو رفتار اس کی تھی وہی اب ہماری تھی یا یوں کہیے کہ اب ہم دُنیا سے زیادہ تیز رفتار نہیں تھے - یہ حالت بالکل ایسی تھی جیسے اسٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے ایک ٹرین سست ہوتے ہوتے دفعتاً رک جاتی ہے - میری طبیعت میں اس وقت سخت امتلا پیدا ہوا - کیونکہ میرے نزدیک دنیا پھر چکر کھا رہی تھی - اور اب وہ کتا جو بے جان چیز کی طرح ہوا میں معلق نظر آتا تھا - ایک لیڈی کی ریشمی چھتری پر گرا جس کے صدمہ سے چھتری میں سوراخ ہو گیا - اور وہ کتا لیڈی صاحب کے منھ پر اسی طرح پڑا جیسے بندوق کی گولی کسی چیز سے پار ہو کر لگتی ہے - اس غیر متوقع واقعہ سے اسقدر شور و غل مچا - اور اسقدر چہل پہل ہوئی کہ عیاذاً باللہ! کتے نے شور مچاتے ہوئے آسمان سر پر اُٹھا لیا - اور سچ پوچھے تو کتا بیچارہ اس قدر تیزی سے پھینکا گیا تھا - کہ ہوا کی رگڑ سے اس کے بال تک جھلس گئے تھے - اسوقت تہلکہ مچ گیا - لوگ ادہر اُدہر بھاگتے پھرتے تھے - بیسیوں کے پاؤں کچل گئے - بیسیوں کرسیاں اُلٹ گئیں - پولیس مین وہاں تعینات تھا - وہ دوڑا ہوا موقعہ پر پہونچا - یہ تو معلوم نہیں کہ معاملہ کیونکر رفع دفع ہوا - کیونکہ ہم دُور ہی کھڑے رہے - جب ہم نے دیکھا کہ ہماری حالت بہت کچھ درست ہو گئی ہے - تو ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع سے الگ ہی الگ رہتے ہوئے ہم نے پروفیسر صاحب نے گھر کا راستہ لیا - لیکن مجمع میں جو کچھ شور و غل ہو رہا تھا - اس میں ہم نے ایک شخص کی آواز سنی جو ٹوٹی ہوئی چھتری والی لیڈی صاحبہ کے پاس کھڑا تھا - وہ پارک کے ایک خادم کو بُری بُری گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا - اور کہتا تھا کہ "اگر یہ کتا تم نے نہیں پھینکا تو اور کس نے پھینکا" اور وہ بیچارہ دم بخود کھڑا ہوا - ان صاحب کی صورت کو تک رہا تھا -

چیخ پکار کی وجہ سے بلکہ درحقیقت اس خوف سے کہ کہیں ہم لوگ کسی آفت میں نہ پھنس جائیں - سیدھے گھر کی طرف چلے - اب اس بائیسکل سوار کا کہیں پتہ تھا نہ اس "گاڑی" کا کہیں نشان تھا - جب ہم مکان پہونچے تو ہم نے یہ بھی حیرت انگیز بات دیکھی کہ جس کھڑکی میں سے ہو کر ہم نکلے تھے وہ بھی کسی قدر جھلس گئی تھی - اور راستہ میں بچھے ہوئے سنگریزوں پر ہمارے پاؤں کے نشانات غیر معمولی طور پر گہرے تھے ———

(اچ - جی - ولز)

ضرورت ہے "نگار" کے حسبِ ذیل جلدوں اور پرچوں کی

(۱) فروری ۱۹۲۲ء تا دسمبر ۱۹۲۶ء (۲) جنوری ۱۹۲۷ء (ایک پرچہ)

(۳) ماہ فروری ۱۹۳۰ء لغایتہ ماہ اپریل ۱۹۳۱ء (مسلسل)

مینیجر نگار سے خط و کتابت کیجیے

آیندہ جنوری سنہ ۳۲ء کا نگار

تقریباً دو سو ۲۰۰ صفحات پر شایع ہوگا۔

اور

مخصوص ہوگا **مطائبات غالب** کیلئے اسوقت تک غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس کی فلسفہ طرازی معنی آفرینی، علوئے خیال، بلندی مفہوم اور دشوار پسندی سے متعلق تھا۔ لیکن یہ راز ابتک سربستہ ہے۔ کہ غالب کی شہرت وکامیابی کا حقیقی راز ان سب سے علیحدہ صرف اس کی شوخی، شوخ نگاری، بذلہ سنجی اور مطائبات پسندی میں پنہاں ہے جنھوں نے اس کے سارے کلام کو خواہ وہ نظم ہو یا نثر، فارسی ہو یا اردو ایک نہایت ہی اچھوتی قسم کی تنقید ملیح (WITTY CRITICISM) میں تبدیل کر دیا ہے۔

یہ مضمون ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں برسوں کی محنت وکاوش کے بعد اس کے اردو کلام سے اسکی فارسی تصانیف سے اس کے رقعات سے اور تمام ان واقعات وحالات سے جو تذکروں اور خود اسکی تصانیف میں ملتے ہیں غالب کی شوخی وشوخ نگاری پر تمام پہلوؤں سے نہایت ہی مکمل بحث کیگئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے۔ کہ غالب کی شہرت وکامیابی کا تنہا راز صرف یہ تھا کہ وہ قدرت کیطرف سے نہایت شوخ وبذلہ سنج طبیعت لیکر آیا تھا۔ اور اسکی ساری زندگی اسکی جملہ تصانیف میں یہی وہ رنگ ہے جو تمام شعراء سے اسے ممتاز بناتا ہے سب سے پہلے ایک بسیط مقدمہ کے ذریعہ سے مثالیں دیدیکر بتایا جائیگا۔ کہ شوخی وظرافت کی دنیا میں کتنی قسمیں ہیں۔ غالب سے قبل کن کن شعراء نے اسے اختیار کیا۔ ہندوستان میں اس رنگ نے کتنا نوع اختیار کیا۔ اور پھر غالب کے اردو فارسی کلام اور اسکے حالات وکوائف زندگی کا استقصار کرکے بتایا جائیگا۔ کہ غالب حقیقتاً کسقدر دلچسپ انسان تھا۔ اور کیسے کیسے نوادر ادب اور لطائف انشاء وہ اپنے بعد چھوڑ گیا ہے۔

یہ کتاب اگر ایک طرف فن تنقید کی بہترین مثال ہے تو دوسری طرف ایسا مجموعۂ ادب ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر ذریعہ تفریح ودلچسپی کا کوئی اور ہو۔ یہ تصنیف غالب کے متعلق بالکل اچھوتی چیز ہوگی۔ اور ہر شخص کے ذوق کو آسودہ کرنیوالی۔ وہ حضرات جو غالب کا صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ انکے لئے اس کتاب کا دیکھنا ایک فرض ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب صرف نگار کے جنوری نمبر میں شایع ہوگی اور اسلئے اسکے حاصل کرنیکا تنہا ذریعہ یہی ہے۔ کہ نگار کی خریداری کو جاری رکھئے اور آپ کے حلقۂ احباب میں جو حضرات اس کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہوں انھیں نگار کی خریداری پر آمادہ کیجئے۔ اسی کے ساتھ غالب کی ایک رنگین تصویر ہوگی، جو اس سے قبل کہیں شایع نہیں ہوئی۔

نیاز

شبنمستان کا قطرۂ گوہریں

قصر بلوریں، جس میں ہر وقت مینا بازار کی سی چہل پہل رہتی تھی ۔ آج بالکل سنسان نظر آرہا ہے ۔ وہ قصر بلوریں جس کے ہر گوشہ سے رقص و سرود کی آوازیں آتی رہتی تھیں جس کے ایوانخانہ میں کنیزوں کے ریشمی ملبوس کی سرسراہٹ ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی تھی ۔ جس کے کمروں میں نقرئی گھونگروؤں کی آواز کے ساتھ ہلکے ہلکے قہقہوں کا لحن ملا ہوا ۔ ہر وقت گونجتا رہتا تھا ——— آج وہی قصر بلوریں ایک مقبرہ کی طرح سنسان ہے ۔ جس کے اندر ملکۂ ناہید پھولوں سے لدی ہوئی سیج پر اس طرح خاموش و ساکت پڑی ہوئی ہے، گویا کہ وہ کسی قدیم ملکۂ مصر کی حنوط شدہ لاش ہے ۔

ایک نوجوان کنیز جس کا زر کار سینہ بند، آب رواں کی ہلکی چادر کے نیچے ایسا نظر آتا ہے، جیسے شفاف موجوں کے نیچے سورج کی تڑپتی ہوئی کرنیں، ہاتھ میں پھولوں کا پنکھا لئے ہوئے اس طرح خاموش کھڑی ہے ؛ گویا کہ وہ کوئی سنگ مرمر کا بنا ہوا مجسمہ ہے جسے بہ لحاظ حسن و جمال ملکہ کی سیج کے قریب جگہ دی گئی ہے ———

دوسری کنیز جس کے عریاں شانہ دوش پر بکھرے ہوئے سنہرے بال ایسے معلوم ہوتے ہیں ۔ جیسے آئینہ میں دُور سے کسی آبشار زریں کا نظارہ ۔ قدموں کے پاس سر جھکائے خاموش بیٹھی ہے ۔ اور بنفشہ کے اُن پھولوں کو دیکھ رہی ہے ۔ جن سے ایک ساعت قبل وہ اپنی ملکہ کے تلوے سہلا رہی تھی ۔ خوابگاہ کے ایک بعید گوشہ میں رقاص کنیزیں جن کی جھکی ہوئی نازک کمر، بکھرے ہوئے بڑے بڑے بال، ایک ہی حال میں قائم ہو کر رہ گئے تھے، خوابگاہ کے مختلف گوشوں میں اس طرح خاموش و ساکت نظر آتی تھیں گویا یہ کسی عجائب خانہ کی مومی تصویریں ہیں ۔ کسی کی انگلی تار کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، لیکن چھو نہ سکی تھی، کسی کا ہاتھ دف سے علیحدہ ہو کر ہٹا ہی تھا کہ وہیں رہ گیا، کوئی رقص کرتے کرتے کمر کو لچکا کر ہاتھ سے فرش کو چھونا ہی چاہتی تھی، کہ اسی حال میں قائم ہو گئی، کسی نے نقرئی گھونگھروؤں میں آواز پیدا کرنے کے لئے اپنی خ...... گلاب کی کلی کی طرح رنگین و خوبصورت ایڑی کو اٹھا کر پنجہ سے فرش پر ٹھوکر مارنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اسی حال میں مجسمہ بنکر رہ گئی، عود دانوں سے مشک و عنبر کا دھواں بل کھاتا ہوا اٹھا تھا، وہ بھی ایک جگہ قائم تھا ۔ اور جب آخری نغمہ کو سنتے سنتے ملکۂ ناہید محو خواب ہوئی تھی ۔ وہ بھی فضا میں اسی طرح گونجتا ہوا رہ گیا تھا ———

یہ قصر بلوریں کی طلسم بند فضا کا اثر تھا کہ جب ملکۂ ناہید سونے کو ہوتی تو غفلتِ خواب کے اولین لمحہ میں جو چیز

جس حال میں ہوتی، اسی طرح قائم و منجمد ہو کر رہ جاتی۔ اور جب وہ بیدار ہوتی تو سب میں آثارِ حیات دفعۃً پیدا ہو جاتے۔ اور جس حالت میں ان پر کیفیت خواب طاری ہوتی وہیں سے پھر اپنے مشغلہ کو شروع کرتے۔

ملکۂ ناہید صبح ہی سے کچھ برہم تھی۔ اور اسی کیفیت کے ساتھ اس کی آنکھ لگی تھی۔ اس لئے جب سہ پہر کو وہ بیدار ہوئی۔ اور خوابگاہ کی تمام کنیزیں خود بخود چونک کر اپنے اپنے مشاغل نشاط میں لگ گئیں، تو اس نے ایک ہاتھ سے اپنی دکھتی ہوئی پیشانی کو پکڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ کے اشارہ سے سب کو منع کر دیا۔ اور آواز کو ایسے حزن و ملال کے ساتھ جیسے بانسری کا کوئی درد بھرا سُر ہو، اس نے حکم دیا کہ "نسرین" کو بلایا جائے۔

ملکۂ ناہید تمام آسمانی مخلوق میں وہی حیثیت رکھتی تھی۔ جو جواہرات میں الماس اور پھولوں میں گلاب کو حاصل ہے۔ اس کا حسن و جمال، اس کی رعنائی اور سب سے زیادہ اس کی نزاکت و خوش ادائی ایک ایسی حقیقت تھی کہ آفتاب کے طلوع سے تو کسی وقت انکار ممکن بھی ہے۔ لیکن اس کے وجود سے انکار محال تھا۔ جب کبھی وہ صبح خانہ باغ کی روشوں پر ٹہلتی ہوتی اور آفتاب طلوع ہوتا تو یہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا کہ آیا آفتاب اس پر طلوع ہوا ہے یا یہ آفتاب پر اور سورج کی کرنیں، اس کے چہرہ کو منور کر رہی ہیں یا اس کے جسم کی شعاعیں آفتاب کو۔ مشہور تھا کہ کوئی متنفس ملکۂ ناہید کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس بجلی کی پھانس اس کے دل سے بہ آسانی نکل گئی ہو۔ اس کا رنگ جسم یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ نسترن زار فردوس کی صباحت میں ہلکا سا رنگ شفق ملا کر بلوری جلد کے نیچے دوڑا دیا ہے۔ آنکھوں کے سکر و خمار کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کبھی کوئی پوری نگاہ کسی پر ڈال دی تو یہ معلوم ہوا کہ کوئی سیلاب ہے، جو "ابدیت" کی طرف بہائے لئے جا رہا ہے ———

شبنمستان کی سلطنت میں جو تمام اطراف و جوانب میں اپنی تازگی و شگفتگی کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ عرصہ سے نسائی حکومت و اقتدار قائم تھا۔ لیکن جو پیچیدگی ملکۂ ناہید کی تخت نشینی کے بعد پیدا ہوئی وہ کبھی رونما نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس سے قبل کوئی ملکہ ایسی نہ تھی جو شادی سے قبل تخت نشین ہوئی ہو۔ اور اس کی شادی کا مسئلہ ملکی مسئلہ قرار پایا ہو ——

ملکۂ ناہید کی ماں اس میں شک نہیں کہ عمر طبعی پوری کرنے سے قبل ہی مر گئی، اور وہ اپنی بیٹی کے لئے کسی شوہر کا انتخاب نہ کر سکی، لیکن اس میں کچھ ضد ملکۂ ناہید کی بھی شامل تھی۔ جو کسی طرح اپنے آپ کو دوسرے کے قبضہ و اقتدار میں دینا پسند نہ کرتی تھی۔ اس لئے وہ ماں کے انتقال کے بعد حسب دستور سلطنت ناہید کی تخت نشین تو ہو گئی لیکن امراء و اکابر سلطنت کے سامنے ایک بڑا اہم سوال یہ آ گیا کہ نظم حکومت میں کسی مردانہ دل و دماغ کو شریک کرنے کی طرف کیونکر ملکۂ ناہید کو مائل کیا جائے۔

ملکۂ ناہید سیاہ کتان کی باریک چادر میں جو ایک طرف شانہ سے ڈھلک کر کہنی تک پہونچی ہوئی تھی، اور دوسری طرف ہر جنبش قدم کے ساتھ ساتھ زمین پر لوٹتی تھی، نہایت افسردگی کے عالم میں آہستہ آہستہ ٹہل رہی تھی - وہ کسی فکر میں مبتلا تھی، اس کے چہرہ سے حقارت آمیز غصہ کے آثار بھی پیدا تھے، پیشانی پر بار بار لٹک پڑنے والی زلفوں کو جس وقت وہ ہاتھ سے اوپر کرتی تھی، تو اس میں بھی برہمی ملی ہوئی نظر آتی تھی، ابرو ئیں کچھ اس طرح تن رہی تھیں - گویا غیر معمولی قوت کے ساتھ کمانوں کو کھینچا جا رہا ہے - اور پیشانی کی ہلکی ہلکی شکنیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے یہاں کا فور سمٹ کر . . . ایک جگہ آگیا ہے - اور اس میں پسینے کے قطرے گویا ہیرے ہیں جو بے ترتیبی سے ادھر اُدھر جڑ دئے گئے ہیں - اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں پر پڑی رہنے والی سیاہ لانبی پلکیں جو مشکل ہی سے کبھی پتلیوں کو پورا نظر آنے دیتی تھیں، اس وقت اور زیادہ مضمحل ہو کر اس طرح نیچے کی طرف مائل تھیں، گویا کسی طائر نے تھک کر اپنے بازو لٹکا دیے ہوں - اس کے پھڑکتے رہنے والے باریک نتھنوں کی نازک رگیں اس وقت سرخ ہو کر ایسی نظر آ رہی ہیں جیسے بلور میں کسی نے عقیق کے ریشے دوڑا دیئے ہوں ——

"نسرین" جو تعلقات قلبی کے لحاظ سے ایک طرف ملکۂ ناہید کی نہایت ہی راز دار، بے تکلف اور قابل اعتماد سہیلی تھی، اور خدمات سلطنت کی حیثیت سے دوسری طرف ایسی کاتب خصوصی کہ جس کی وساطت بغیر محکمۂ وزارت کا بھی کوئی کاغذ پیش نہ ہو سکتا تھا - سامنے کا زرلفتی پردہ ہٹا کر دروازہ میں آکر اس طرح ٹھہری - گویا کہ وہ خود کوئی زرکار پردہ ہے - اس نے تھوڑی دیر وہیں کھڑے کھڑے ملکۂ ناہید کی حالت کا اندازہ کیا - اور پھر تیزی لیکن پوری احتیاط ادب کے ساتھ آگے بڑھی - اور ملکہ کے سامنے جھک کر مسکراتے ہوئے عرض کیا کہ "ملکۂ عالم" اُس دن کا واقعہ آپ کو یاد ہے جب منصور کے کاغذات حضور میں پیش کئے گئے تھے - اور آپ کو معلوم ہے - کہ خودکشی کرتے وقت اس نے کیا کہا تھا" ملکہ نے کہا "مجھے نہیں معلوم، بتا اس نے کیا کہا تھا - نسرین بولی "اس کے آخری الفاظ جو سمع مبارک تک نہیں پہونچ سکے یہ تھے کہ " اے ملکۂ جاں ایک بار تجھے اس عالم میں دیکھنے کے بعد کس کافر کو پھر زندہ رہنے کی تمنا ہو سکتی ہے، تجھ سے محبت کرنے کے جرم میں، جلاد کے تیشہ سے تیری غیبت میں ہلاک ہونا اگر ناکامی عشق کی انتہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تیری برہمی کو آسودہ کرنے کے لئے تیرے ہی حضور میں خود اپنے ہاتھ سے جان دیدینا محبت کی کامیابی نہ سمجھی جائے" اسی لئے میں کہتی ہوں - کہ اے ملکۂ عالم خدا کے لئے . . . . . . آپ کبھی برہم نہ ہوا کریں - کہ پھر . . . . . . کوئی انسان عقل و دماغ کے توازن کو قائم نہیں رکھ سکتا - خوف و اندیشہ سے نہیں بلکہ جذبۂ ایثار و محبت سے - دنیا اگر آپ سے محبت کرتی ہے تو کرنے دیجئے - آپ اس کے مٹانے کے پیچھے کیوں پڑی ہیں - آپ کہاں تک اُس آفت کا مقابلہ کریں گی - جو قدرت نے آپ کے سراپا میں ودیعت کر کے اس وقت تمام شبستان پر نازل کی ہے - مرد کے نام سے آپ کو جتنی نفرت ہوتی جاتی ہے، مرد اتنا ہی زیادہ آپ پر مائل ہو رہا ہے - اور محبت سے آپ جسقدر بیزار ہوتی جا رہی ہیں اتنی ہی شدت

سے یہ چیز آپ کے سامنے پیش ہو رہی ہے - پھر نہ آپ کو اس کا خیال کہ مقررہ آئین سلطنت کے لحاظ سے ایک مردانہ دماغ کی شرکت آپ کے ساتھ کس قدر ضروری ہے - نہ اس کا اندیشہ کہ یہ جو آپ کو دیکھ کر ہر شخص دیوانہ سا ہو جاتا ہے - اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے - اب رہا یہ کہ جب کائنات کی ہر چیز دو مل کر ایک ہو جانے کیلئے بیتاب ہے تو آپ میں کیوں یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی - سو اس کے متعلق میں کیا عرض کر سکتی ہوں - خدا ہی اس کو بہتر جانتا ہے کہ یہ صرف آپ کے ضبط کی انتہا ہے یا کچھ اور . . . . . . "

ملکۂ ناہید نے جو ہمیشہ نسرین کی اس قسم کی گفتگو سے بہت لطف لیا کرتی تھی - مسکرا کر نسرین کا ہاتھ پکڑا - اور بولی " سچ بتا کیا واقعی تجھے یقین ہے کہ اس وقت کی تیری گفتگو سے میرے اندر مرد کی جنس کا کوئی خیال عزت پیدا ہوا ہوگا - اے میری حسین ناصح، میں نے تجھے اس وقت دفتر وعظ و پند کھولنے کے لئے نہیں بلایا تھا، بلکہ ایک نہایت اہم امر میں مشورہ کرنے کے لئے، جس نے مجھے کل صبح سے بیتاب بنا رکھا ہے - پرسوں رات کو میں نے ایک خواب دیکھا ہے - اور مجھ پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا ہے - کہ یا تو اپنے ملک سے چن چن کر ایک ایک مرد کو باہر نکال دوں یا خود ہی اس سرزمین سے نکل کر باہر رہوں جب تک ایک مرد بھی یہاں سانس لینے والا باقی ہے "

نسرین - " ملکۂ عالم، آپ کے دشمن اس ملک کو چھوڑیں جس پر حکومت کرنا آپ کا فطری و موروثی حق ہے، یہ کمبخت مرد ہی نہ نکل جائیں، جنھوں نے اپنی انتہائی بدقسمتی سے آپ کو اپنی طرف سے اس قدر بیزار کر دیا ہے - مگر میں سنوں تو سہی کہ وہ کیا خواب ہے " یہ کہہ کر "نسرین" نے اپنی چادر سے ایک شیشہ نکالا - اور اس کے اندر سے سنہرے رنگ کی ایک سیال شے جام بلوریں میں بھر کے ملکہ کے سامنے پیش کی ———

ملکۂ ناہید - یہ کیا ہے - کیا کوئی نئے قسم کا افشردۂ انگور ہے - مگر اس میں تو یہ رنگ پیدا نہیں ہو سکتا - ؟

نسرین - " ملکۂ عالم، یہ ایک خاص قسم کا شربت ہے جس کے مزہ میں ہلکی سی تلخی لیکن کیفیت و اثر میں بڑی شیرینی ہے - میں نے نہایت محنت سے اس کو "ملکۂ عالم" کے لئے تیار کیا ہے - اور میں چاہتی ہوں - کہ آپ اس کو چکھیں تاکہ یہ اضمحلال و افسردگی دور ہو "

اس وقت تک ملکۂ ناہید نے کبھی شراب نہیں پی تھی - اور نہ شبستان والے اس چیز سے واقف تھے، لیکن جب وزرا نے دیکھا کہ ملکۂ ناہید کے جذبات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی تو انھوں نے ملک کے اطبا و حکما سے مشورہ کیا - اور انھوں نے بہت غور کے بعد کہا کہ ایک تدبیر جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کی یہ بھی ہے کہ ملکہ کو شراب کا استعمال کرایا جائے، چنانچہ مہینوں کی محنت سے اس کو تیار کیا گیا - اور نسرین سے کہا گیا کہ وہ ملکہ کے سامنے پیش کرے -

(باقی)

نیاز

بابُ الاستِفسار

ترکی زبان

(جناب احمد کریم صاحب۔ مزگاؤں بمبئی)

مَیں نے بعض احباب سے سُنا ہے کہ ترکی زبان بہت لطیف ہے، چنانچہ سجاد حیدر صاحب یلدرم نے جو ترجمے اس زبان سے کئے ہیں اور آپ نے ایک آدھ بار "نگار" کے ابتدائی زمانے جو نمونے اس زبان کی لطافت کے پیش کئے تھے۔ اُن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ میں عرصہ سے خواہشمند ہوں کہ یہ زبان حاصل کروں لیکن یہاں اس وقت تک کوئی شخص ایسا نہیں مل سکا جس سے سیکھ سکتا۔ کیا آپ مطلع فرما سکتے ہیں کہ اس زبان کے وہ کیا خصوصیات ہیں جنھوں نے اس کو اسقدر لطیف بنا دیا ہے۔ اور اس کے حاصل کرنے کی کیا تدبیر ہے؟"

(**نگار**) مَیں اس زبان کا ماہر نہیں کہ کوئی ماہرانہ جواب دے سکوں۔ البتہ ایک ناقص و ناکمل حد تک میں نے اسے ضرور حاصل کیا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ میرا جواب ویسا ہی ہو گا۔

ترکی انشاء کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جس کا تعلق بالکل عامیانہ و بازاری گفتگو سے ہے، دوسری علمی و مذہبی کتابوں کی انشا اور تیسری وہ جو بلند شاعرانہ خیالات کی حامل ہوتی ہے۔ اور جسے وہ اپنی اصطلاح میں "انشاء عالیہ" کہتے ہیں۔

قسم اوّل سے بحث کرنا بیکار ہے، کیونکہ اس کا علم وہیں جاکر ہو سکتا ہے۔ اور نہ غیر ملک والا اس میں کوئی قابل ذکر ذخیرہ علم و ادب کا پا سکتا ہے، دوسری قسم کی انشا میں کوئی خاص بات قابل لحاظ نہیں سوائے اس کے کہ اسمیں تقریباً ۵۰ فی صدی الفاظ عربی و فارسی کے استعمال ہوتے ہیں، البتہ جہاں تک مصادر و افعال کا سوال ہے وہ اکثر و بیشتر خالص ترکی زبان کے پائے جاتے ہیں۔

ترکی زبان کا لٹریچر جس چیز کو کہتے ہیں۔ وہ حقیقتاً اس کی تیسری قسم "انشار عالیہ" کی ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ وہ خیال کی نزاکت، مفہوم کی لطافت، شاعرانہ بلندی، اسلوب ادا، ندرت بیان اور پاکیزگی ذوق کا ایسا نمونہ پیش کرتی ہے۔ کہ مشکل ہی سے کسی دوسری زبان میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ چونکہ ترکی سلطنت کی تاریخ اس کا ماحول اور اس کا جغرافیہ ایک زمانہ تک عرب، فارس اور سرزمین یوروپ سے بیک وقت متعلق رہا ہے، اور ان تمام قطعات زمین کی تہذیب و شائستگی سے اس کو متاثر ہونا ضروری تھا۔ اس لئے اگر ان کے لٹریچر میں عربی کا جوش، فارسی کی نزاکت خیال اور فرانسیسی زبان کی شیرینی و لطافت پائی جاتی ہے تو حیرت نہ کرنا چاہیے۔ پھر اسی کے ساتھ آپ خود ترکی قوم کی ذہانت، قومی احساس، جذبات حریت اور ذوق جمالیات کے نشو و نما کی اہلیت کو بھی ملا لیجئے۔ اور غور کیجئے کہ جب یہ تمام باتیں کسی قوم میں مجتمع ہوجائیں گی تو اُن کے لٹریچر کا کیا رنگ ہوگا۔ اور وہ کون سی خوبی ہے جو اُن کی انشار میں نہ پائی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ ترکی قوم، معاشرت و تمدن کے لحاظ سے نہایت ہی خود دار اور مہذب و شائستہ ہے۔ (گو علوم و فنون کے لحاظ سے ترقی یافتہ نہ ہو) اس کا ثبوت آپ کو ان کے لٹریچر سے بہ آسانی مل سکتا ہے۔

چونکہ خود داری و غیرت ان کے خمیر میں داخل ہے اس لئے جب وہ دوسرے سے خطاب کرتے ہیں تو ہمیشہ اس کی عزت کا پورا لحاظ کرتے ہیں۔ تاکہ وہ بھی اسی احساس کے ساتھ کلام کرے۔ چنانچہ دو بے تکلف دوست بھی جب باہم گفتگو کریں گے۔ تو یہی معلوم ہوگا کہ وہ حد درجہ تصنع سے کام لے رہے ہیں، حالانکہ وہ تصنع نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی زبان کی تہذیب میں داخل ہے۔

وہ کبھی ایک دوسرے کی مزاج پُرسی اس سادگی سے نہیں کریں گے کہ "آپ کیسے ہیں"، یا "آپ کا مزاج کیسا ہے" بلکہ وہ یہ کہیں گے۔ "مزاج عالیلر یکز نصلدر"، یعنی لفظ مزاج کے ساتھ صرف لفظ عالی کی نسبت کافی نہیں سمجھی گئی۔ بلکہ اس میں بھی علامت جمع لر کا اضافہ کرکے گویا یہ مفہوم پیدا کر دیا کہ "آپ کا مزاج گرامی جو اپنے بلند و عالی ہونے کے لئے بہت سے اسباب رکھتا ہے کیسا ہے"۔

وہ انگریزوں کی طرح صرف "گوڈ مارننگ یا گوڈ ایوننگ" پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اس کو بہت بڑھا کر حد درجہ عزت و احترام کا مفہوم لئے ہوئے یوں کہتے ہیں:-

صباح شریفلر خیر لر اولسون - یا - آقشام شریفلر خیر لر اولسون

صباح یا آقشام (شام) کی ایک صفت شریف قرار دی اور پھر اس میں اور خیر دونوں میں علامت جمع لگا کر یہ معنی پیدا کئے کہ "جناب کی صبح یا شام جو نہایت معزز ہے، خدا کرے بہت سی برکات اپنے ساتھ لائے"۔

یہاں ہندوستان میں قاعدہ ہے کہ جب اپنے کسی بے تکلف دوست کی بیوی کا حال دریافت کرتے ہیں۔ تو پوچھتے ہیں "گھر میں کیا حال ہے، بیگم کا مزاج کیسا ہے" اور حد درجہ بے تکلفی میں یہ بھی کہتے ہیں کہ "بھابھی جان کیسی ہیں"

ترکوں میں جب کسی کی بیوی کا حال دریافت کریں گے تو ہمیشہ یوں کہیں گے کہ "ہمشیرہ نصلدر" (ہماری بہن کیسی ہیں)۔ ظاہر ہے کہ بھابھی (یعنی بھائی کی بیوی) کہنے اور بہن قرار دینے میں کسقدر تفاوت ہے۔ اور ان دونوں سے علیحدہ علیحدہ جن جذبات کا پتہ چلتا ہے، وہ باہمدگر کسقدر مختلف ہیں۔

مزاج پرسی کے جواب میں وہاں صرف "شکریہ" کہہ کر نہیں ٹال دیتے۔ بلکہ اس کا اظہار اس اہتمام سے کرتے ہیں کہ:- "حسن توجہکنزہ تشکر ایدرم افندم" (اے میرے سردار میں آپ کے حسن توجہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں)

کیسا ہی بے تکلف دوست اُن کے پاس آئے لیکن وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور اگر دن میں سو دفعہ آئیگا تو سو بار اس کا خیر مقدم ان الفاظ سے کریں گے۔ "خوش گلدیکز۔ صفا گلدیکز آفندم" یعنی آپ خوب آئے اور میرے لئے مسرت و پاکیزگی لے کر آئے"۔

الغرض ترکوں کی معاشرت و معیشت اور تہذیب و شائستگی کی جان ان کی فطری خودداری ہے۔ جو اُن کے لٹریچر سے بھی ہر جگہ ظاہر ہوتی ہے۔ اور جس سے اس امر کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو قوم روز کی معمولی باتوں میں اسقدر رکھ رکھاؤ کی پابند ہوگی۔ وہ جذبات محبت یا دنیائے حسن و عشق میں کتنی بلندی خیال کا اظہار کرتی ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی انشاء عالیہ بہت دقیق ہوتی ہے۔ اور تخیل کی نزاکت سے جو پیچیدگی عبارت میں پیدا ہونا چاہیئے وہ ان کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان میں "تعلیقات" کا اتنا زبردست سلسلہ ہوتا ہے۔ کہ بعض بعض جملے آٹھ آٹھ، دس دس سطر میں بھی ختم نہیں ہوتے، اور بسا اوقات یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ فلاں فقرہ کس فقرہ سے متعلق ہے۔ اور فلاں لفظ کو کس لفظ سے رابطہ ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ چونکہ وہ اپنے بلند اور پھیلے ہوئے خیالات کو مختصر الفاظ میں ظاہر کرنا چاہتے ہیں اسلئے ان کو خاص خاص ترکیبیں استعمال کرنی پڑتی ہیں اور اسی لحاظ سے ان کی گرامر (صرف و نحو) میں بھی بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ میں ان کی زبان کے اختصار اور اسی کے ساتھ اس کی وسعت کی ایک مثال پیش کرتا ہوں

تمام دنیا کی زبانوں میں جب کسی فعل لازم یا متعدی کا تعدیہ کیا جاتا ہے تو اس کا درجہ ایک تعدیہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ مثلاً لکھنا کہ اس کا تعدیہ لکھانا یا لکھوانا ہوگا۔ اور اس کے آگے پھر کوئی تعدیہ مزید نہ ہوگا۔ لیکن ترکی زبان

میں تین تین بار تعدیہ ہوتا ہے۔ مثلاً
"بیلمک" جاننا کے معنے میں آتا ہے اس کا ایک تعدیہ کر کے وہ بیلدیرمک" (علم کرانا یا بتانا) کہیں گے لیکن جب کسی اور شخص کے ذریعہ سے دوسرے کو کسی بات کا علم کرائیں گے تو بیلدیرتمک" کہیں گے۔ اور جب دو واسطوں سے علم کرائیں گے تو بیلدیرتدیرمک" کہیں گے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کسی زبان میں وسعتِ مفہوم کا اسقدر خیال صرف ونحو میں کیا جاتا ہو۔ —— دوسری مثال ملاحظہ کیجئے:۔

ہم جب کسی شخص کے آنے کی خبر دیتے ہیں تو کہتے ہیں "وہ آیا"۔ اس کو ترکی میں کہیں گے۔ "گلدی"۔ لیکن اگر "آنے" کا حال کسی اور ذریعہ سے معلوم ہوا ہے تو پھر وہ بجائے گلدی "کے گلمش" کہیں گے۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ آیا" اسی لئے ان کے یہاں ماضی کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی ہے جسے وہ ماضی نقلی کہتے ہیں۔ اور اس سے بہت سے مشتقات پیدا کرتے ہیں۔ یہ بات آپ شاید کسی زبان کی صرف ونحو میں نہ پائیں گے۔

الغرض اسی طرح کی اور بہت سی خصوصیات اس زبان کی ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے مفہوم کو وہ کسقدر مختصر طور پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی گرامر (صرف ونحو) بہت کچھ اردو سے ملتی جلتی ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مستثنیات بہت کم ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیل سے لکھنا بیکار ہے۔ کیونکہ جب تک کسی کو ان کا علم نہ ہو یا کوئی سیکھنا نہ چاہے مشکل سے بتایا جا سکتا ہے۔

اس زبان میں علاوہ عشقیات کے ایک بڑا ذخیرہ حماسیات (قومی شاعری) کا بھی ہے، جو شروع ہی سے بچوں کو سکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں کی ریڈروں کی حکایتیں، نظمیں وغیرہ سب اسی جذبہ سے لبریز نظر آتی ہیں۔ اور اسی حریت خیال کا نتیجہ ہے کہ آج ترکی پھر باوقار آزادانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس وقت مجھے ایک نظم کے کچھ اشعار یاد آ گئے جو وہاں کی کسی ریڈر میں میری نگاہ سے گزرے تھے۔ اس نظم کا عنوان "کوچوک عسکر" (ننھا سپاہی) ہے۔ جذبات ملاحظہ ہوں:۔

کوچوک عسکر سلاح الدہ	ننھا سپاہی ہاتھوں میں اسلحہ لئے ہوئے
قہرمانجہ ایلرلہ یور	ایک ہیرو کی طرح آگے بڑھتا جا رہا ہے۔
قارشیسندہ بوتون بلدہ	سارا شہر اس کے آگے آگے یہ نعرہ لگا رہا ہے کہ
"قہرمانم یاشا" دیور	"ہمارا ہیرو خدا کرے زندہ رہے"
کوچوک عسکر، کوچوک عسکر	اے ننھے سپاہی
وطن سندن خدمت استیر	وطن تجھ سے خدمت کا طلبگار ہے

مینی مینی اوموزلرک
طاشیہ جق یارین توفک
توفک دگل وطن یارین
اوا موزہ یوکلنہ جک
کوچوک عسکر کوچوک عسکر
وطن سندن غیرت ایستر

یہ تیرے ننھے ننھے بازو
کل بندوق اٹھائیں گے
لیکن یہ بندوق نہ ہوگی بلکہ وطن ہوگا
جسے تو اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہوگا
اے ننھے سپاہی
وطن تجھ سے غیرت کا طلبگار ہے۔

اسی طرح کی ایک اور نظم "ترکی جھنڈے" کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے۔ جس کا عنوان "عثمانلی بیراغی" ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:-

ارطغرلک اجاغندہ اویاندک
شہیدلرک قانلر ایلہ بویاندک
نیجہ دشمن قلعہ سنہ اوزاندک
سنسز توتماز عثمانلی اجاغی

(تو نے خاندان ارطغرل میں آنکھ کھولی، خون شہداء سے اپنے آپ کو رنگ کر کیسے کیسے دشمنوں کے قلعوں پر تو لہرایا ــ (حقیقت یہ ہے کہ) تو نہ ہو تو کسی ترکی گھرانے کا چولھا روشن ہو ہی نہیں سکتا۔)

ترکی نظموں میں اب سے قبل اُسی عروض کی پابندی کی جاتی تھی، جو فارسی میں رائج ہے۔ لیکن اب کچھ زمانہ سے جدید عروض پیدا ہوئی ہے جسے "عروض ملی" کہتے ہیں اور جو بالکل انگریزی نظموں کی طرح الفاظ کے ٹکڑوں (Syllables) کے وزن پر قائم کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں نظمیں جو اوپر لکھی گئی ہیں، "عروض ملی" میں ہیں۔

میں نے ایک نہایت بسیط کتاب ترکی صرف و نحو پر مرتب کی ہے، لیکن اس کو اس لئے شائع نہیں کر سکا کہ لوگوں میں اس زبان کے مطالعہ کا شوق بہت کم ہے، بہرحال اگر آپ واقعی اس زبان کے سیکھنے پر مُصر ہیں تو میں مختلف اسباق کے ذریعہ سے آپ کو کم از کم اس کے صرف و نحو پر ضرور عبور کرا سکتا ہوں اب رہا زبان کا آنا سو اس کو آپ کتابیں اور اخبارات دیکھ کر لغت کی مدد سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اصل چیز اس کا صرف و نحو جاننا ہے اور اس کے بتانے کی ذمہ داری بیشک میں اپنے سر لے سکتا ہوں۔

نیاز

عورت کی آزادی کی انتہا غلامی ہے

اس وقت متمدن دنیا میں ترقی کی جو صورتیں پیدا ہو رہی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں اور خصوصیت کے ساتھ عورتوں نے جس بے جگری و عزم مردانہ کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں اقدام شروع کیا ہے اس پر تو آج ہر شخص کی نگاہیں پڑ رہی ہیں لیکن غور طلب یہ ہے کہ کیا عورت اپنی آزادی کی آخری منزل کو حاصل کر چکی ہے، اگر نہیں تو وہ منزل کیا ہے اور پھر یہ کہ اس منتہا تک پہونچنے کے بعد وہ اپنی موجودہ آزادی و ترقی پر اظہار ندامت و افسوس تو نہ کریگی؟

عورت کی آزادی کی تاریخ اب سے ایک صدی قبل شروع ہوتی ہے جب اس نے سب سے پہلے اپنے لئے حق انتخاب مردوں سے طلب کیا، چنانچہ وہ نہ اس مطالبہ میں کامیاب ہوئی اور مردوں کے ساتھ تمام حقوق میں اس کو مساوی سمجھ کر پارلمنٹ کے انتخاب میں، مجالس بلدیہ میں، عدالت گاہوں میں، بھی جگہیں دی گئیں ۔ یہ تو خیر زندگی کے وہ شعبے تھے جنکا تعلق تمدن کے امن و سکون سے ہے، لیکن عورت جو آزادی کی لذت سے آشنا ہو چکی تھی اس پر قناعت نہ کر سکتی تھی، اس نے حریصانہ ایک قدم اور بڑھایا اور اس نے اُن اعمال حیات پر بھی قبضہ کرنا چاہا جو مردوں ہی کے لئے زیادہ موزوں تھی یعنی فوج و پولیس کی ملازمت، دفاتر و صیدلیات کا تعلق، عسکری ریاضتیں، شمشیر زنی، نیزہ بازی، جہازرانی، طیران ہوائی، شہسواری، الغرض وہ کونسی محنت و مشقت ایسی ہے جو عورت کے نرم ہاتھوں اور نازک اعضاء نے برداشت نہیں کی صرف اس دُھن میں کہ وہ مردوں سے پیچھے نہ رہے، صرف اس نشۂ آزادی میں کہ کیوں اسے دوسری مقابل جنس سے ضعیف و کمزور سمجھا جائے۔

جہاں تک نیت کا سوال ہے، کون ہے جو عورت کی اس جد و جہد پر نکتہ چینی کرے گا، لیکن گفتگو اس میں ہے کہ آزادی کے لئے عورت کی یہ بڑھی ہوئی خواہش کہیں اُسے پھر تو غلام بنا دینے والی نہیں ہے ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ عورت یقیناً اپنے ان جذبات کے ماتحت رجعت قہقری کر رہی ہے اور اس کی موجودہ آزادی ایک ایسی زنجیر تیار کر رہی ہے جس سے خود اس کے ہاتھ پاؤں جکڑے چلے جا رہے ہیں ۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے آئیے پہلے عورت کے اس عہد پر غور کیجئے جسے عہد تاریک سے تعبیر کرتے ہیں

اُس وقت عورت کی کیفیت یہ تھی کہ سوائے صید و جنگ کے کوئی کام ایسا نہ تھا جو عورت کے سپرد نہ ہو ۔ مرد

اورخاندان کی خدمت کا تمامتر بار اسی پر تھا، وہی زراعت کرتی تھی، وہی کھیتیاں کاٹتی تھی، وہی مکان بناتی تھی، وہی کنوؤں سے پانی کھینچتی تھی اور وہی بار برداری کی خدمت انجام دیتی تھی، یہانتک کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ روئے زمین پر گدھوں اونٹوں، ہاتھیوں کی باربردارانہ قطار میں تاریخ سب سے پہلے جس بارکش جانور کا پتہ دیتی ہے وہ عورت ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ پہلے کشتی بنانے والے اپنی کشتی کے سرے پر ہمیشہ عورت ہی کی صورت بنایا کرتے تھے اور آج بھی بار برداری کے سب سے بڑے ذرائع جہاز اور ریل کے الفاظ یوروپ کی زبانوں میں مونث ہی استعمال ہوتے ہیں۔

پھر دیکھو کہ خود یوروپ میں جہاں ہر عورت کو کسی وقت مریم کی سی عزت دی جاتی تھی، آج اس کی حالت کیا ہے۔ کیا وہ حقیقتاً اب بھی بار برداری کی خدمت انجام نہیں دیتی جو کسی وقت قرون مظلمہ میں اس کے سپرد تھی۔ اگر اس میں کسی کو گفتگو ہو تو وہ یوروپ کے کسی شہر میں چلا جائے اور سڑک پر کھڑے ہو کر دیکھے کہ عورت کس حال میں اس کے سامنے سے گزرتی ہے

تم دیکھو گے کہ ایک تسمہ کے ذریعہ سے بہت بڑا مخروطی شکل کا ٹوکرا اس کی پشت سے بندھا ہوا ہے جس میں غلہ، روٹی، برتن، پانی سے بھرا ہوا ظرف اور خدا جانے کیا کیا وزن رکھا ہوا ہے جسے عورت اپنی نازک پیٹھ پر لادے ہوئے سر کے سہارے سے سنبھالے ہوئے چلی جارہی ہے، کہیں اگر تم یہ بار پشت پر نہ دیکھو گے تو پہلو میں دیکھو گے اس حال میں کہ ایک کاندھے پر اس کا بچہ بیٹھا ہوا ہے اور دوسری طرف لکڑی کا بوجھ بندھا ہے —— پھر یہی نہیں کہ عورت سے صرف بار برداری کا کام لیا جاتا ہو بلکہ وہ اور بھی بہت سے چاکرانہ کام انجام دیتی ہے، چنانچہ افریقہ میں وہ زمین جوتی ہے، مویشی چراتی ہے، بازار کا کام کرتی ہے اور مکان بناتی ہے۔ امریکہ کی قدیم ہنود آبادی کا بھی یہی عالم ہے کہ جب یہاں کوئی جانور شکار کیا جاتا ہے تو عورت اس کا گوشت پوست اپنی پیٹھ پر لاد کرلے جاتی ہے، کھال کی دباغت کرتی ہے اور گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کو خشک کرتی ہے، درختوں کا کاٹنا، ایندھن جمع کرنا، نہروں اور کنوؤں سے پانی لانا، آگ روشن کرنا، کھانا پکانا، گھر کے تمام فرائض انجام دینا، مردوں بچوں کے لئے کپڑے سینا بھی اسی کے سپرد ہے۔ اور جب مکان بدلا جاتا ہے تو وہی اسباب باندھتی ہے، اور اپنی پیٹھ پر لاد لاد کر دوسری جگہ پہونچاتی ہے درانحالیکہ اس وقت مرد کی پشت پر سوائے ایک ہلکی بندوق کے اور کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ اگر دریا کا سفر ہوتا ہے تو مرد ایک چھوٹی کشتی پر بیٹھ کر روانہ ہو جاتا ہے اور عورت بڑی کشتی پر تمام سامان لاد کر اسے اپنے عرق پیشانی کے ساتھ کھینچ کر منزل تک پہونچاتی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اخیر میں جب سموئیل ہیرن نے شمالی کناڈا کی سیاحت کی اور بہت سی مشکلات سے سامنا پڑا تو اس نے کہا کہ یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ ہمارے قافلہ کے ساتھ کوئی عورت نہ تھی کیونکہ مرد کے لئے ان تمام بار برداریوں کے بعد شکار اور قطع مسافت بہت دشوار ہے۔ اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ عورت فطرت کی طرف سے بہت ہی متحمل و جفاکش واقع ہوئی ہے اور جتنا بوجھ دو مردوں سے نہیں اٹھ سکتا اسے وہ تنہا لے جاتی ہے۔ الغرض عورت کی زندگی عہد تاریک میں بالکل یہی تھی جو بیان

کی گئی اور جس کی یادگاریں اب بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہیں ۔

جنگ عظیم سے قبل یوروپ کی عورت تمام اعمال شاقہ کی طرف سے مطمئن تھی، نہ وہ بوجھ اٹھاتی تھی، نہ محنت وجفاکشی کی خدمات اس سے لیجاتی تھیں، اور اس قسم کے قوانین وضع ہو گئے تھے کہ ان سے شدید محنت کے کام نہ لئے جائیں گویا تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ مرد نے اس کی نازک ساخت کا لحاظ کرکے اس کی رعایت ملحوظ رکھی۔ لیکن جب جنگ شروع ہوئی اور ضرورت نے مجبور کیا کہ عورتیں ان مردوں کی جگہ لیں جو میدان قتال کو گئے تھے تو پھر حالت بدلی اور عورتیں... تمام مشاغل حیات میں اپنی پہلی جفاکشی کے ساتھ کام کرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ موٹر اور ٹرام وہ چلانے لگیں، دفاتر میں وہ ملازم ہوئیں، دوکانوں اور کارخانوں میں انھوں نے ملازمتیں اختیار کیں اور ایسے ایسے کام شروع کئے جو حد درجہ محنت چاہتے تھے ——— پھر جب جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ یوروپ میں عورتوں کی تعداد مردوں سے ۱۰ لاکھ زیادہ ہو گئی ہے اس لئے ان کے لئے ضرور ہوا کہ وہ کسب معاش کے سلسلہ کو قائم رکھیں اور چونکہ وہ آزادی کے ذوق سے آشنا ہو چکی تھیں اس لئے پھر انھوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ گھروں کے اندر بیٹھ کر چولھا چکی کا کام کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ بیکار مردوں کی جماعت بڑھنے لگی چنانچہ آج انگلستان، جرمن اور امریکہ میں جو بیکار مردوں کی تعداد لاکھوں سے کروڑوں تک پہونچ گئی ہے اس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ اُن کی جو جگہیں دوران جنگ میں عورتوں نے لے لی تھیں ان پر وہ ہنوز قابض ہیں اور مردوں کو اجازت نہیں دیتیں کہ اپنی اصل جگہ پر واپس آئیں۔ بلکہ بڑا سبب یہ ہے کہ عورتیں اور بھی تمام مشاغل زندگی میں مردوں کے خدمات کو اپنے سر لیتی چلی جارہی ہیں اور جہاں تک تکمیل کا تعلق ہے وہ حقیقتاً مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہے ——— پھر اس نسائی آزادی کی رو کا جو سب سے زیادہ خراب اثر نظام تمدن پر پڑنے والا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ فی الحال مردوں کو فرصت مل گئی ہے کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر آرام کی زندگی بسر کریں، اس لئے اگر چند دن بعد انھیں پھر میدان عمل میں آنا پڑا تو اُن کے قوا جواب دے چکے، اور عادی نہ رہنے کی وجہ سے اُن سے کوئی کام نہ ہو سکے گا۔ پھر اگر آج ہی فیصلہ ہو جائے کہ آیندہ سے عورت ہی مردوں کے فرائض انجام دے گی اور مرد، قدیم عورت کی طرح صرف اہلی ذمہ داری اپنے سر لینے پر قناعت کرے گا، تو اس میں شک نہیں کہ مردوں کے لئے اس میں ایک حد تک سہولت ضرور ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کہیں ان جذبات کے ماتحت عورت اپنی... ذمہ داریوں کو اس حد تک تو نہیں بڑھا رہی جب اس آزادی کے شوق میں اُسے آخر کار پھر اپنی خدمات ومشاغل کا غلام ہو جانا پڑے گا اور عہد تاریک سے ...... سوائے اِس کے کوئی فرق نہ رہیگا کہ اگر اُس زمانہ میں وہ صرف اپنے شوہر کی بیوی تھی تو اب اُسے ساری دُنیا کی بیوی بننا پڑے گا، اور اگر پہلے اس کے پاؤں میں صرف ایک زنجیر تھی تو اب سیکڑوں زنجیریں خود اپنے ہاتھ سے بنا بنا کر اپنے آپ کو مجبور و پابند بنا رہی ہے ؟

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اب یہ آزادی کی رَو کسی طرح رُکنے والی نہیں اور زمانہ جو عبارت ہے اس نوع کے مدوجزر سے جب تک ایک بار مرد کو عورت اور عورت کو پوری طرح مرد نہ بنالے گا چین نہیں لینے دیگا

نیاز

چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کیساتھ مصنفہ حضرت نیاز فتحپوری (اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن وسکون کا راستہ معلوم کریں تو اس کو ملاحظہ کیجئے)

مادیین کا مذہب مصنفہ حضرت نیاز (وجود باری کے ثبوت میں بے مثل مضمون)

حرکت کے کرشمے مصنفہ حضرت نیاز (اگر آپ قدرت کے کرشموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں) تینوں ایک ہی جلد میں ضخامت ۲۰۰ صفحات علیحدہ علیحدہ نہیں ملسکتیں

قیمت معہ محصول عہ

منیجر نگار

فراست الید۔ مولفہ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص باسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج وزوال موت وحیات صحت وبیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

جذبات بھاشا جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کیساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونہ پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲ر

شاعر کا انجام۔ جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن وعشق کی تمام نغمہ کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں ۱۰ر

نگارستان (دوسرا اڈیشن) حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے قیمت ... عہ ر

گہوارۂ تمدن (دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکہ آرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا تہذیب شائستگی اسکی کسقدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ... عہ ر

شہاب کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخئیل اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے قیمت ... عہ ر

تذکرۂ خندۂ گل۔ مولفہ عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف وظرائف وانتخابات کلام کے درج ہیں قیمت معہ محصول عہ ر

منیجر نگار

جدید جرمنی کی رجعت عہد اسپارٹا کی طرف

بارہ سال قبل جب جرمنی جنگ عظیم کی مصیبت سے آزاد ہوا تو اس کی کیفیت ایک ایسے شکستہ ناخن و فرسودہ بال طایر کی سی تھی جو دست صیاد میں اپنی آخری سانسیں لے رہا ہو۔ اجتماعی نظام برباد تھا، اقتصادی توازن درہم برہم ہو چکا تھا، اندرون ملک کی مختلف الخیال جماعتوں نے عمرانی امن و سکون کو مضطرب کر رکھا تھا، اور کامیاب دشمن اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

اگر یہ حالت کسی اور ملک کی ہوتی تو کیا ہوتا؟ وہ ہاتھ پاؤں ڈال دیتا، آنکھ بند کرکے یاس کے عالم میں ان دشواریوں کے سامنے سر عجز خم کر دیتا اور ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے مٹ جاتا۔ لیکن جرمن قوم اس راز سے واقف تھی کہ انسان نام ہے صرف تفاؤل و نشاط کا، امید و توقع کا، سعی و عمل کا اس لئے اس نے نہایت صبر و ثبات سے اس مصیبت کا مقابلہ کیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ افق سے بادل چھٹنے لگے، ملکۂ اقبال و ظفر نے اپنے چہرہ سے نقاب الٹنا شروع کیا اور چند سال کے اندر انسانی جد و جہد کا ایسا عدیم المثال نمونہ اس نے پیش کیا کہ شاید ہی کوئی دوسری نظیر اس کی تاریخ عالم میں پیش کی جا سکے۔ پھر آج کون اس سے بے خبر ہے کہ اس نے تاوان جنگ کس پابندی و فراخدلی سے ادا کیا، ملکی صنعت و تجارت کو کس حد تک فروغ دیا، علوم و فنون کی ترقی میں وہ کہاں سے کہاں پہونچ گیا اور اقتصاد و تمدن کی تمام بازاروں اور منڈیوں پر سایۂ شاہین کی طرح کیونکر چھا کر رہ گیا

وہی جرمنی جس پر بعد از جنگ تمام دول مغرب اس طرح نگاہیں ڈال رہی تھیں گویا وہ کسی کے سکرات کا تماشہ ہے کہ اس کے ختم ہوتے ہی اس کی لاش کو لے جا کر کسی جگہ دفن کر دینا ہے، ہاں وہی جرمنی جس کو کرگسان یورپ نے بوٹیاں نوچ نوچ کر ہڈیوں کے ایک مضمحل ڈھانچہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ آج پھر وہی عفریت پیکر جرمنی ہے جو اس سے قبل کبھی پایا جاتا تھا، وہی اس کا طنطنہ ہے اور وہی اس کی عظمت و جلال، وہی اس کے عزائم ہیں اور وہی لرزہ براندام کر دینے والی اس کی ترقیاں۔ ایشیا حیران ہے کہ یہ کیا معجزہ تھا، یہ کون سی مافوق العادت کرامت تھی، یہ کیا سحر و افسوں تھا، لیکن یورپ کا ایک ایک فرد واقف ہے کہ یہ معجزہ تھا اس کی پامردی کا، یہ کرامت تھی اس کے عزم و ثبات کی اور یہ سحر و افسوں تھا اس جد و جہد کا جس کو انھوں نے ایشیا سے سیکھا اور پھر ایشیا ہی کے خلاف استعمال کیا اور کر رہے ہیں۔

آئیے آج کی صحبت میں جرمنی کے میدان عمل میں اس ایک منظر پر نگاہ ڈال لیں جس کو خصوصیت کے ساتھ ہم لوگوں

نے نظر انداز کر دیا ہے اور جس کی طرف خود جرمنی کو بھی پہلے کوئی خاص توجہ نہ تھی اور وہ منظر اس کی ریاضت بدنی کا ہے۔ پھر اس سے مقصود اس کا خود اپنی انفرادی صحت نہیں ہے۔ بلکہ یہاں بھی وہی قومیت کا خیال ساتھ ساتھ ہے کہ اس طرح آیندہ نسل صاحب عزم و ارادہ پیدا ہوگی اور ملک پر اگر پھر کوئی مصیبت پڑی تو زیادہ پامردی کے ساتھ اس کا مقابلہ کر سکے گی۔

چنانچہ اس وقت اگر کوئی شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ کر وہ حیران رہ جائے گا کہ جسمانی ریاضت و ورزش کی طرف وہاں کے مرد و عورت کس شدت کے ساتھ متوجہ ہوئے ہیں اور اسی کے ساتھ اقتصادی خیال نے انھیں کس قسم کی تہذیب جدید پر مائل کر رکھا ہے۔

اس وقت جرمنی کی اُن خصوصیات ظاہری میں سے جن کو آج بہ اول نظر ہر شخص دیکھ سکتا ہے تین ہیں۔ ایک تو عریانی کا خیال ہے کہ جسقدر کم سے کم کپڑا ممکن ہو استعمال کیا جائے، دوسرے ان کے ورزشی مشاغل ہیں جن میں ہر فرد انتہائی جوش نشاط کے ساتھ منہمک نظر آتا ہے اور تیسرے وہاں کا جدید طرز عمارت ہے جس نے ملک کو بالکل نئے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ سچ ہے جنگ صرف جسم انسانی ہی کو ہلاک نہیں کرتی بلکہ وہ قوموں کے ذوق و معاشرت میں بھی عظیم انقلاب برپا کر دیتی ہے، چنانچہ عریانی کا خیال صرف اقتصادی مجبوری ہی کے ماتحت ان میں پیدا ہوا ہے کہ کیوں ضرورت سے زیادہ کپڑا صرف کیا جائے یہاں تک کہ اسی خیال کے ماتحت اب وہ داڑھی کے ساتھ اُسترے سے خود ہی اپنا سر بھی مونڈ لینا پسند کرتے ہیں۔

آج جرمنی کے باغوں، تفرج گاہوں، میدانوں، سڑکوں اور گلیوں میں ہر جگہ تم دیکھو گے کہ لوگ جانگھیا پہنے ہوئے پکڑ رہے ہیں، دھوپ اور ہوا میں ورزشیں کر رہے ہیں پیراکی کی مشق میں مصروف ہیں اور اس طرح ریاضت بدنی میں مصروف ہیں گویا کہ سب سے بڑا فرض انسانی یہی ہے۔ ایک جماعت وہاں ایسی بھی ہے جو برائے نام ستر پوشی کو بھی پسند نہیں کرتی اور بالکل عریاں رہنا اس کا مسلک ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے جوار جرمنی میں بہت سے کلب ہیں جہاں حماموں اور حوضوں میں مرد و عورت بالکل مادر زاد عریاں حالت میں نہاتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔

جرمنی کی عورت کے متعلق قبل از جنگ مشہور تھا کہ وہ گھر میں بیٹھے رہنے اور بُننے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی، لیکن اب یہ عالم ہے کہ دنیا کا کوئی کھیل، کوئی مظاہرۂ قوت و ورزش ایسا نہیں ہے جس میں وہ ممالک یوروپ کی نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کے ساتھ برابر کا حصہ نہ لے رہی ہو۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس سے مقصود صرف تفریح نہیں ہے بلکہ مُدعا یہ ہے کہ اُن کی نسل پر اچھا اثر پڑے اور اسی لئے اُن کی ورزش کے طریقے تمام یوروپ سے مختلف ہیں، اور حکومت بھی اس مقصد میں ہر طرح ان کی مدد کرتی ہے۔

جب ان لوگوں کو فرصت ملتی ہے یہ لوگ جنگلوں میں، باغوں میں، پہاڑوں پر پیادہ پا پہونچ جاتے ہیں، اور

تہذیب جدید و تمدن حاضر کے تمام تکلفات سے بری ہو کر نہایت ہی سادہ و پُر لطف تفریح و ورزش میں اپنا وقت بسر کرتے ہیں - یہاں سیکڑوں ہوٹل، قہوہ خانے روز نئے نئے پیدا ہوتے جاتے ہیں جہاں نہایت قلیل اُجرت پر مردوں اور عورتوں کو جگہ دی جاتی ہے اور یہاں یہ لوگ جمع ہو کر کھیلتے کودتے ہیں، ریاضت بدنی کرتے ہیں اور باہمدگر مسائل حاضرہ پر گفتگو گویا کہ اس وقت وہاں کا ہر ہوٹل ایک کلب ہے اور وہاں کا ہر فرد اس کلب کا ممبر جو اپنی پوری قوت اس بات پر صرف کر رہا ہے کہ جرمنی قوم دنیا پر چھا جائے اور سارے عالم پر اس کے تصرف و اقتدار قائم ہو جائے۔

کیا ان واقعات میں ہمارے لئے کوئی سامان بصیرت و عبرت پنہاں ہے یا نہیں اور کیا ہم بھی کبھی اس راز کو سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا نام ہے صرف حرکت و عمل کا مگر ایسی "زود پشیمانیاں" ہمارا حصہ کیوں ہونے لگیں ؟

نیاز

مثنوی لالہ رُخ

طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ صرف ۱۰۰ جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ معہ محصول ۱۲؍

نقاب اٹھ جانے کے بعد

حضرت نیاز کے تین بے مثل افسانوں کا مجموعہ صرف ۵ جلدیں باقی ہیں معہ محصول ۸؍

(دونوں معہ محصول ۱۲؍ میں)

مذاکراتِ نیاز

یعنی

حضرت نیاز فتحپوری کی ڈائری

اگر ابھی ملاحظہ سے نہیں گزری تو فوراً طلب فرمائیے۔ بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں

معہ محصول ۱؍

مینیجر نگار

فضا کی مملکت میں

دس میل کی بلندی پر انسانی تصرف و تنفس کی پہلی مثال

سوئٹزرلینڈ کا مشہور عالم آگسٹ بیکر، براکسل یونیورسٹی میں طبعیات کا پروفیسر پہلا شخص ہے جس نے گزشتہ جون میں ۵۸۱۴۵ فٹ یا تقریباً دس میل کی بلندی تک پرواز کی - یہ الومنیم کے ایک کرہ یا بہت بڑے گیند کے اندر جو چاروں طرف سے بند تھا بیٹھا اور اس کرہ کو ایک بڑے غبارہ سے باندھ کر اس نے اپنا ہوائی سفر شروع کیا - جس بلندی تک یہ پہونچا اس وقت تک کوئی انسان نہیں پہونچ سکا تھا -

اس میں شک نہیں کہ اس سے قبل بعض غبارے اس سے بھی زیادہ بلند جا چکے ہیں، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں جو غبارہ سواحل گرین لینڈ سے اڑایا گیا تھا وہ ۲۴ میل کی بلندی تک پہونچا اور اسی طرح جرمنی کا وہ غبارہ جو گزشتہ سال کے ستمبر میں شہر ہمبرگ کے پاس سے اڑا تھا بائیس میل بلند ہوگیا، لیکن یہ دونوں غبارے انسانی وجود سے خالی تھے -

اس وقت تک انسان فضا کے اتنے بلند حصوں تک نہیں پہونچ سکا اور نہ علم بشری تا ایندم ان تمام طبقات ہوا کی دبازت کا اندازہ کر سکا جو کرۂ زمین کو محیط ہیں -

اس میں شک نہیں کہ جس قدر ہم زمین سے بلند ہوتے جاتے ہیں ہوا کی لطافت بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک جگہ پہونچ کر یہ لطیف ترین ہوا بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد وہ خلا شروع ہو جاتا ہے جس کے حدود اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکے - بعض کا خیال ہے کہ وہاں ایک مادۂ اثیری بھرا ہوا ہے لیکن اس کا کوئی علمی ثبوت اس وقت دریافت نہیں ہو سکا -

سر جیمس جینز جو اس زمانہ کا مشہور عالم ہے کہتا ہے کہ ۲۰۰ کیلومیٹر (کیلومیٹر ایک میل سے کچھ زاید ہوتا ہے) کی بلندی پر ہوا اسقدر لطیف ہو جاتی ہے - کہ اس کے ایک مکعب سنٹی میٹر (میٹر ایک گز سے کچھ زاید ہوتا ہے) میں صرف تین لاکھ دقائق ہوا کے پائے جاتے ہیں درانحالیکہ زمین سے متصل ان کی تعداد . . . . ۲۰ (تین مہا سنکھ) تک ہو سکتی ہے - اب سے قبل مدرسوں میں یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ ہوا کا کرہ صرف ۱۰۰ میل کا ہے، لیکن اب جدید تحقیقات سے اس کی تکذیب ہوتی ہے -

علمار نے ہوا کے دو طبقے کئے ہیں ایک وہ جو کرہ زمین سے متصل ہے جس کا نام (   ) طبقہ ادنےٰ ہے اور دوسرے کا نام (   ) طبقۂ اعلیٰ ہے۔ طبقہ ادنےٰ میں ہم جس قدر ہم بلند ہوتے جاتے ہیں درجۂ حرارت گھٹتا جاتا ہے لیکن طبقۂ اعلیٰ کا درجۂ حرارت قائم ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ان دونوں طبقوں کے درمیان حد فاصل قطبین کے اوپر ماورار خط استوار واقع ہے یعنی وہ ۵۰ ہزار فٹ خط استوار سے اور ۲۰ ہزار فٹ قطبین سے بلند ہے،

طبقۂ اعلیٰ کا درجۂ حرارت قائم ہے اور سطح زمین پر جو درجۂ حرارت پایا جاتا ہے اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہ طبقہ اور دوسرے طبقات پر مشتمل ہے جو اس سے زیادہ لطیف ہیں لیکن ان کی تعداد معلوم نہیں۔ گمان کیا جاتا ہے کہ یہ طبقات تین ہیں جن کے اندر ریڈیو (لاسلکی کہربا) کی لہر گزر جاتی ہے لیکن پھیلتی نہیں اور پھر کرہ زمین پر واپس آجاتی ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ پروفیسر پیکر نے یہ تجربہ اس لئے کیا تھا کہ اتنی بلندی سے وہ چاند کو رصد کرے گا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ دو ماہ قبل جب پروفیسر پیکر نے پرواز کی ہے، چاند ہم سے تین ہزار میل زیادہ قریب تھا اور علمار نے اسی وقت اس کو یہاں رصد کر لیا تھا۔ الغرض پروفیسر پیکر کی یہ پرواز مطالعۂ قمر سے متعلق نہ تھی بلکہ اس کے مقاصد کچھ اور تھے اور منجملہ ان کے ایک یہ تھا کہ وہ فضار بلند اور برقی لہر کے تعلق کو معلوم کرے اور اسی کے ساتھ یہ بھی تحقیق کرے کہ فضائی شعاعوں کے کیا خواص ہیں اور جوہر فرد اور اس کے اندر چھپی ہوئی عظیم قوتوں کی کیا کیفیت ہے کیونکہ اس وقت علما فضائی شعاعوں اور اُن کی لاانتہا قوت کے تو قائل ہیں۔ لیکن ابھی تک یہ نہیں معلوم کر سکے کہ یہ شعاعیں کیوں اور کہاں سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ یہ کوشش اپنی قسم کی پہلی کوشش نہ تھی، جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے دو بار پہلے زیادہ بلندی تک غبارے پہونچ چکے ہیں لیکن وہ انسان سے خالی تھے۔ جو مہیں انسان غباروں کے اندر بیٹھکر گیئے ہیں ان میں سے قابل ذکر صرف یہ چار ہیں:-

(۱) سنہ ۱۸۶۲ء میں انگلستان کے دو شخص گلیشر اور کاکسول غباروں کے ذریعہ سے اُڑے اور ۳۷ ہزار فٹ تک بلند چلے گئے، لیکن آکسیجن کی کمی سے یہ لوگ ہلاک ہوتے ہوتے بچے اور مشکل سے نیچے اُتر سکے۔

(۲) سنہ ۱۹۰۱ء میں جرمنی کے دو شخص برسون اور سوریرنگ نے کوشش کی اور ۳۵۴۳۵ فٹ سے زیادہ نہ جا سکے۔

(۳) سنہ ۱۹۲۷ء میں کپتان گرے ۴۲۴۷۰ فٹ یا ۸ میل سے زاید بلندی تک پہونچ گیا لیکن جب یہ چھتری کے ذریعہ سے اُترا تو مر گیا۔

(۴) سنہ ۱۹۳۰ء میں امریکہ کا ایک شخص لفٹنٹ سوسیک ۴۳۱۶۶ فٹ تک پہونچا۔

لیکن پروفیسر بکرؔان سب پر سبقت لے گیا کیونکہ اس کی پرواز ۵۱۴۵۸ فٹ تک پہونچ گئی اور پھر صحیح سلامت واپس آ گیا۔

پروفیسر بکر نے اخبار کے نمایندوں کو جو بیان دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :—

"جو آلات اپنے ساتھ ہم لے گئے تھے انھوں نے کام دیا لیکن بعض فضا کے اثر سے بیکار ہو گئے۔ ہم کو اپنی تحقیق علمی میں اس ذریعہ سے خلاف توقع بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ ہمارا غبارہ اس قدر تیزی سے اڑا کہ ۲۵ منٹ میں ۱۵۰۰۰ مٹر کی بلندی تک پہونچ گئے اور یہ وقت ۹ بج کے ۴۵ منٹ صبح کا تھا۔"

ہم نے پرواز کے دوران میں مناظر طبیعی کی طرف بالکل توجہ نہیں کی بلکہ اپنے علمی آلات کی طرف متوجہ رہے غبارہ کی کم سے کم رفتار ۱۵ مٹر فی ثانیہ تھی۔

مقام انسبروک سے ہم کو کہربائی اشارے بھیجے گئے لیکن وہاں ہم اتر نہیں سکے، کیونکہ ہم گیس کے خزانہ کو آہستہ آہستہ نہ کھول سکے کہ غبارہ رفتہ رفتہ اتر سکتا اور دفعۃً کھول دینا گویا ہلاکت کا مترادف تھا۔

ہوا کے طبقۂ اعلیٰ میں گرمی ناقابل برداشت ہے کیونکہ ۵۰ سے ۶۰ درجۂ سنٹی گراڈ تک پہونچتی ہے۔ لیکن اندر درجۂ حرارت ۱۴ تک تھا۔

رات کو قصبۂ گیرگل کے قریب ایک ایسے پہاڑ پر اترے جو بالکل برف پوش تھا، اور ۲۷۰۰ مٹر سطح بحر سے بلند ہے۔ ہم فضا میں ۱۶ گھنٹے رہے اور اس دوران میں مطلق کوئی خوف ہم پر طاری نہیں ہوا، اور ہماری آرزو ہے کہ آیندہ اس سے زیادہ بلند پہونچ کر علمی تفتیش کریں۔

اس وقت تک خیال کیا جاتا تھا کہ طبقۂ اعلیٰ سے اوپر بالکل خلا ہے، لیکن پروفیسر بکر کی اس مہم سے معلوم ہوا کہ وہاں بھی ہوا ہے اور اس میں بھی وہی عناصر پائے جاتے ہیں جو کرۂ ارض کی ہوا میں موجود ہیں۔

یہ ہیں کارنامے ایک زندہ قوم کے زندہ افراد کے۔ لیکن ہمارے یہاں کے اکابر کو ان نقوش قدیمہ سے ہٹنے کی کہاں فرصت ہے جو عہد مظلمہ کی علمی دنیا نے ان کے دلوں پر کندہ کر دیئے ہیں۔ (ترجمہ)

صحابیات - جس میں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیے گئے ہیں اس کا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشا میں لکھا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲؎

منیجر نگار

اعتبارات

کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا بڑا صاحب اقتدار اور غیر معمی عقل و فراست رکھنے والا ــــــــ اس شہر کے وسط میں ایک کنواں تھا جسکے صاف و شیریں پانی سے شاہ و وزیر اور تمام شہر والے فائدہ اٹھاتے تھے کیونکہ وہاں صرف یہی ایک کنواں تھا

ایک رات ساری بستی سو رہی تھی کہ کوئی ساحرہ چپکے سے آئی اور کنویں کے اندر سات قطرے کسی دوا کے ڈالکر بولی کہ "جو شخص اس کنویں کا پانی پئے گا، دیوانہ ہو جائیگا"۔ صبح ہوئی سب نے حسب معمول کنویں کا پانی پیا اور ساحرہ کے قول کے مطابق سب دیوانے ہو گئے۔ لیکن بادشاہ اور اس کے وزیر نے پانی نہ پیا

جب یہ خبر تمام شہر والوں کو معلوم ہوئی تو وہ ہر ہر گلی میں دیوانہ وار پھر پھر کر یہ آواز بلند کہنے لگے کہ "ہمارا بادشاہ اور وزیر دیوانے ہیں انہیں اب حکومت کی اہلیت باقی نہیں رہی، اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ان کو معزول کر دیں"

شام کو جب یہ خبر بادشاہ کے کانوں تک پہونچی تو اسنے حکم دیا کہ اُس کنویں کا پانی لایا جائے۔ چنانچہ ایک کاسۂ زریں وہ پانی لایا گیا۔ بادشاہ نے پیالہ لیکر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور جو پانی بچا تھا وہ وزیر کو پلا دیا۔

شہر کی تمام آبادی مسرور ہے کہ ہمارا بادشاہ رہِ راست پر آگیا اور اب وہ ہم پر حکومت کرنے کا اہل ہے

گزشتہ رات میں نے قدیم خیال کے دو عالم دیکھے جن میں سے ہر ایک دوسری کی تحقیر کرتا تھا۔ ان میں سے پہلا کافر تھا، اور دوسرا مومن۔

ایک بار یہ دونوں شہر میں جمع ہوئے اور اپنے اپنے انصار کے سامنے خدا کے وجود و عدم وجود پر جنگ کرنے لگے جب مسلسل گھنٹوں تک لڑتے رہنے کے بعد وہ تھک گئے تو ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی راہ لی،

اسی دن شام کو وہ کافر ہیکل میں گیا اور قربانگاہ کے سامنے اپنی دیوی کے حضور میں اپنے تمام گناہوں سے تائب ہو کر مومن ہو گیا

اسی وقت اس مومن عالم نے اپنی کتاب مقدس کی غلط تعلیم پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ اس کا مذہب حد درجہ تنگ نظر ہے اور کافر و زندیق ہو گیا۔

اس رسالہ کے ساتھ ایک مطبوعہ خط آپکو ملیگا براہ کرم اسکی خانہ پُری کر کے دفتر نگار کو بھیجدیجئے۔ منیجر

"درسِ عمل"

انسان تک رسائیِ دستِ فنا نہیں — تحلیلِ زندگی ہی اساسِ حیاتِ نو
اعمالِ زشت و خوب نہ جائیں گے رائیگاں — تیار ہو رہا ہے لباسِ حیاتِ نو

تکلیف دست و پا سے کسی کو مفر نہیں — آسودگیٔ دل ہی مگر جنتِ حیات
آلودۂ گناہ نہ ہو دامنِ خیال — پاکیزگیٔ روح سے ہی نزہتِ حیات

بیکار کارزارِ جہاں میں نہیں گذر — مردانہ وار راہِ طلب میں ہو گام زن
دار العمل میں کوششِ پیہم ضرور ہے — ناکامیوں کا رنج نہ ہو حوصلہ شکن

ہر لمحۂ حیات ہو صرفِ تلاشِ حق — ہر حال میں ہو پیشِ نظر اُسوۂ سلف
حسنِ عمل سے دے وہ پیامِ نشاطِ روح — دنیا تجھے بعجز کہے ارشدِ خلف

تیرا وجود ہو سبق آموزِ زندگی — تیری حیات گرمیٔ ہنگامۂ عمل
کہتے ہیں جس کو اہلِ نظر راہِ مستقیم — سب مان لیں کہ ہے وہ ترا جادۂ عمل

عقلِ سلیم، فکرِ رسا، مایۂ یقیں — عزمِ صمیم، جوشِ عمل، ہمتِ بلند
طغرائے امتیاز ہیں طغرائے امتیاز — قومیں انھیں سے ہوتی ہیں عالم میں ارجمند

کوکب

پرانی یادگاریں

تو عقل کے دھوکے میں، صرفِ تکمیل رہِ نادانی ہے
تاچند یہ جوشِ خوابِ گراں، اے دوست اک دنیا فانی ہے

تاریک ہے شب، غم کی لہریں بیچین ہیں قلبِ دوراں میں
اک تو کہ رہینِ آسائش ہے، بیخبری کے ایواں میں

مصروف ہے تیری کاوشِ دل احساسِ غمِ انسانی میں
اور رات کا گہرا سناٹا ہے، قصرِ حیاتِ فانی میں

خوابیدہ ہے نبضِ موجِ صبا جنبش سی نمایاں خاک میں ہے
تو لالہ و گل کا طالب ہے اور دامِ خس و خاشاک میں ہے

تاچند امیدِ آسائش اس صبر شکن جانکاہی میں؛
ملتا ہے سکونِ منزل بھی، اے دوست اکیں گمراہی میں

ممکن ہو تو درسِ بینش لے، مجروح فریبِ بینائی!
کیا چیز ہے، عجزِ خاک نشینی ہو کہ غرورِ دارائی

یہ اُجڑے ہوے بام و گنبد، یہ سقفِ کہن، تھرائی ہوئی
ایامِ سلف کی عظمت ہے اسوقت بھی جنپر چھائی ہوئی

بکھرے ہوئے ملتے ہیں انہیں ذراتِ مہِ کامل ابتک
سینوں میں دھڑکتے ہیں انکے کچھ حوصلہ پرور دل ابتک

اس رہگزرِ برباد سے گزرا، قافلۂ سلطانی بھی؛
اس خاکِ پریشاں سے اُٹھے، ساونت بھی رنگ ما نی بھی

ڈوبی ہوئی نبضوں میں انکی دھیما سا ہے اب بھی جوش وہی
نغمے نہ سہی، جلوے نہ سہی، احساس وہی ہے ہوش وہی

ہر چند کہ شب کے سائے میں ظلمت کے علم لہراتے ہیں
اس بزم کے بے قیمت ذرے خورشید سے ٹکر کھاتے ہیں

کھلتا ہے ضمیرِ انساں پر اس خاک کی دھیمی آہوں سے
اک قافلۂ اربابِ کرم، گزرا تھا کبھی ان راہوں سے

غلطاں ہیں یہاں، ذرّوں میں، بہار رفتہ کے گرم آنسو ابتک — آتی ہی ہوا کی لہروں سے بھینی بھینی، خوشبو اب تک
اک کیف سا ابتک پنہاں ہی، اس روح شکن خاموشی میں — بیمثل تھی اس میخانہ کی صہبائے عمل سرجوشی میں
اللہ، یہ کس مسرور کی یاد حسن تبسم آتی ہے — کچھ بات تو ہے ابتک جو یہاں اک برق سی لہرا جاتی ہے

صدیوں سے چمکتا ہی سورج ان اوج نشاں دیواروں پہ — برسوں سے لرزتے ہیں تارے ان سر بفلک میناروں پر
کڑکی ہی پرافشاں برق، ہوائیں تیز و پریشاں گزری ہیں — اس عالم آب و خاک میں ان پر یونہی، صدیاں گزری ہیں
دنیا نے ہزاروں مرتبہ انکے سامنے پہلو بدلا ہے — اچھوں کو بگڑتے پایا ہی، بگڑوں کو سنورتے دیکھا ہے
پنہاں نہیں ان ویرانوں سے اسرارِ حیات انسانی — اب بھی تو ہجوم سوزِ دروں سے گرم ہی انکی پیشانی
آفاق میں انکی آنکھوں نے سو طرح کے منظر دیکھے ہیں — ادبار کے نشتر کھائے ہیں، اقبال کے تیور دیکھے ہیں
کس درجہ فزوں ہیں یارب انسان کی فانی تدبیریں — آئنہ ہیں کس شوق و ارماں کا آہ یہ اُجڑی تعمیریں
ہلتی ہی بنائے دشت و جبل، امواج ہوا لیے پڑا ہیں — انسان کی ہستی کیا شی ہے انساں کی تمنائیں کیا ہیں
آدیکھ! مقام عبرت ہی، ای بندۂ نفس و نادانی! — تا چند ملالِ ناکامی، کب تک طلب عیشِ فانی
تا چند درونِ قلب غم ایام کے نشتر کھائے گا — آلام کی رَو تھم جائیگی، عشرت کا سماں مٹ جائے گا

مقصود ہی گر تعمیرِ چمن، پروائے خس و خاشاک نہ کر
عرفاں کی بلندی کو ناداں! اوہام زبوں سے خاک نہ کر

علی اختر (از حیدرآباد دکن)

تاروں بھری رات

تاروں سے بھر گیا ہے دامن عروس شب کا
کیا بن سنور گیا ہے، دامن عروس شب کا

افلاک کی جبیں پر تارے چمک رہے ہیں
یا نیلگوں قبا میں موتی دمک رہے ہیں

یا دل دھڑک رہے ہیں دنیائے آسماں کے
یا منتشر ہیں جلوے انوارِ بیکراں کے

یا رات کی جوانی، جوبن دکھا رہی ہے
دل کو لبھا رہی ہے، دل میں سما رہی ہے

یا پھر زمیں کے جلوے، گردوں میں آ گئے ہیں
لمعات جگنوؤں کے رفعت پہ چھا گئے ہیں

جا کر یہ کون پوچھے، پُر نور آسماں سے
یہ ننھے ننھے جلوے آئے ہیں کس جہاں سے

یہ رات کے نظارے، یہ آسماں کا جوبن
یہ نور پوش تارے، یہ آسماں کا جوبن

خاموشیوں کی لے میں جادو بھرا ہوا ہے
نغموں کا سحر، نیندیں، بن بن کے چھا رہا ہے

اک محویت ہے طاری، ارض و سما کے دل پر
مُلکِ فنا کے دل پر، مُلکِ بقا کے دل پر

سرمست ہیں ہوائیں، سرشار ہیں فضائیں
پھیلی ہوئی ہیں شب کے انوار کی قبائیں

دنیا کی محفلیں سب خاموش ہو گئی ہیں
راحت کے جام پی کر، بے ہوش ہو گئی ہیں

یا رات کی نگاہیں، نیندوں سے بےخبر ہیں
یا میری سرد آہیں نیندوں سے بےخبر ہیں

عدم

انقلاب

عبرت آموز ہے گلکاریٔ ایوانِ جہاں جس کا ہر نقش تغیر کا پتا دیتا ہے
حیرت افزا ہی عجب شاہدِ فطرت کا طلسم کہ جو انسان کو مبہوت بنا دیتا ہے
خاکِ صحرا سے نکلتا ہے ہوا کا جھونکا چرخ پر ابر کا اک فرش بچھا دیتا ہے
جلوۂ برق وہ رکھتا ہے نہاں سینے میں موتی پیشانیٔ عالم پہ گرا دیتا ہے
صحنِ بستاں میں نسیمِ سحری کا انداز غنچہ کو خوابِ پریشاں سے جگا دیتا ہے
دینۂ مہرِ جہانتاب مژہ سے اپنی پردۂ شب رخِ گیتی سے اُٹھا دیتا ہے
دورِ باطل میں جو اُٹھتا ہے کوئی شیرِ خدا نعرۂ حق سے وہ دنیا کو ہلا دیتا ہے
آہ جانسوز سے ظلمت کدۂ عالم میں جلوۂ برق جہانتاب دکھا دیتا ہے
زلفِ دوراں میں وہ مشاطۂ فطرت بنکر اک لڑی گوہرِ مقصد کی بڑھا دیتا ہے
اس کا ہر تارِ نفس بادِ تمنا بن کر دل شگوفہ کی طرح سب کے کھلا دیتا ہے
صفحۂ دل پہ جو ہوں جور پرستی کے نقوش صورتِ حرفِ غلط ان کو مٹا دیتا ہے

دردِ ملت کا جو آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو
رُخِ گیتی پہ عجب غازہ چڑھا دیتا ہے

(محمود اسرائیلی)

نوائے پریشاں

صبح کی انتہا ہوئی   شام کی ابتدا ہوئی
رنگِ شفق دمک چکا   بزمِ سکوں بپا ہوئی
کم ہوئی گرمیٔ زمیں   رقص میں پھر صبا ہوئی
کشمکشِ حیات میں   مائلِ التوا ہوئی
چشمِ ستارۂ فلک   نور سے آشنا ہوئی

اُف یہ سوادِ شام ہے
ہجر کا یا پیام ہے

بحرِ فلک میں کشتیاں   کرتی ہیں نور پاشیاں
ٹوٹ رہے ہیں قمقمے   کوندرہی ہیں بجلیاں
محفلِ اخضری میں پھر   ہوتی ہیں کیف باریاں
دیں گی مجھے فریب کیا   میری نظر فریبیاں
حسنِ سکوتِ شب کی یہ   خاص فریب کاریاں

محشرِ خامشی ہے یہ!
منظرِ بے ہشی ہے یہ!!

جلوۂ حسنِ طور ہے   جنتِ رنگ و نور ہے
تابشِ کہکشاں نہیں   جلوہ گریٔ حور ہے
ہے "جو سکوتِ متصل"   اصل میں ناصبور ہے
جلوۂ بے خودی نہیں   "فلسفۂ شعور" ہے
جو ہے جمودِ کیف میں   اصل سے اپنی دور ہے

حسن اگر خموش ہے
عشق تو نالہ کوش ہے!

منظرِ آب کا سماں   غیرتِ موج گلستاں
خندۂ ماہِ نو میں ہے   "سیل" جمال کی رواں
بحر کے ہر حباب میں   "شوق" کی ایک داستاں
کھل گئے رازہائے دل   اُف رے "سکوتِ بے زباں"
رمزِ خفی ہے آشکار   لاکھ کرے کوئی نہاں

ہر طرف اک جمال سا
بعد میں اتصال سا!!

حسنِ چمن میں ہے نمو   گل میں ہے حسنِ رنگ و بو
شبنمِ کیف پاش سے   کرتے ہیں پھول بھی وضو
شب کی سیاہ زلف کو   پھیلنے کی ہے آرزو
نکہتِ گل ہے بے قرار   جیسے حریصِ جستجو
شمع کی ضو فشانیاں   وجہ جمالِ شمع رو

حسنِ سکوں کہیں نہیں
ٹھہری ہوئی زمیں نہیں!

کیف میں ہے خمار سا   پھول چمن میں خار سا
دل کو سکون ہے مگر   پھر بھی ہے بے قرار سا
نرگسِ نیم باز میں   کچھ نہ کچھ انتظار سا

جبر کے جزو جزو میں رنگ ہے اختیار سا
ذرّے ہیں جمع کو بجو پھر بھی ہے انتشار سا
شوق نہیں تو کچھ نہیں
ذوق نہیں تو کچھ نہیں!

غیر ہیں خوش ہمیں نہیں چین سر زمیں نہیں!
کہتی ہے گردشِ فلک کون ہے جو حزیں نہیں؟
سجدے سے ہے جو دور تر کام کی وہ جبیں نہیں
"ذکرِ عمل ہے لطف کیا ذوق نہیں یقیں نہیں!
عرصۂ روزگار میں لطفِ سکوں کہیں نہیں!!
ان کی ہمیں خبر نہیں
نالوں میں کچھ اثر نہیں
آج کی بھی خبر نہیں دوش پہ بھی نظر نہیں
بڑھ گئی خواہشِ عدم دہر میں اب گذر نہیں

صبح نہ ہو جو کیف زا شام ہے وہ سحر نہیں!
ہو جسے شور و شر سے کام کچھ ہو، مگر بشر نہیں!!
طول ہے غم کی داستاں قصہ یہ مختصر نہیں
اٹھے گے شررفشاں ہو تو
دہر میں پھر عیاں ہو تو
دل میں یہ غور کر ذرا چلتی ہے کون سی ہوا
درد، جگر کا کیا مٹے جب نہیں درد کی دوا
اپنے خیال میں ہے مست اچھا کوئی ہو یا برا
جب نہ قبول وہ کریں پھر ہے عبث یہ التجا
حافظ "طالبِ حیات" آئے گی ایک دن قضا
غیر کا آسرا نہ کر
درد کو لا دوا نہ کر!

حافظ

اب کوئی خضاب نہ لگائیے

اگر آپکے بال پکنے لگے ہوں۔ دانت ہلتے ہوں۔ پائیریا۔ دانتوں سے خون و پیپ آتا ہو۔ مسوڑھوں میں درد۔ یا آنکھوں کی روشنی میں کمی۔ یا دماغ کمزور ہوکر سر چکراتا ہو۔ تو اس فقیری منجن ہزار ا کو جو ہزاروں آدمیوں پر آزمایش کر لیا گیا ہے۔ ۴۰ روز استعمال فرما کر قدرت خدا کو ملاحظہ کریں دانت مثل موتی کے چمکیلے اور آبدار رہینگے بڑی خوبی یہ ہے کہ بالوں کا سفید ہونا ایکدم بند ہو جائیگا اور جو بال سفید ہو چکے ہیں رفتہ رفتہ کل سیاہ ہو جائینگے ہزاروں بوڑھے جوان ہو چکے ہیں جس فقیری منجن سے ہلتے ہوئے دانت جڑ جائیں اور بالوں کا سفید ہونا بند ہو جائے اسکے دیگر معمولی فوائد کیا بیان کئے جائیں کل شکایتیں دور ہو جائینگی۔ بوڑھے جوان اور عورت بچوں کو مفید ہے جلد منگوا کر فائدہ اٹھائیے غلط ثابت ہو تو حلفیہ بیان آنے پر دوگونی قیمت واپس ہوگی چالیس یوم کیلئے رعائتی قیمت معہ محصولڈاک (عہ)

منیجر مفید عام دواخانہ نمبر ۸ دربھنگہ (بہار)

ایک غلطی درست کر لیجیے

حضرت نیاز کی ڈائری میں صفحہ ۸۴ کے بالکل اختتام پر ایک حصۂ عبارت کا حسب ذیل چھوٹ گیا ہے۔

"جو نگاہ مجھ پر پڑے وہ شیروں کی افشاں پر نہ ہو بلکہ ایک مالک کی خادم پر ہو۔ یہی سبب ہے کہ میں اس کے جذبۂ تفوق کی جو قدر تا اس کے دل میں . . . ."

جن حضرات کو یہ کتاب پہونچ چکی ہے وہ اس میں درستی فرمائیں یہاں باقی جلدوں میں درستی کر دی گئی ہے۔

منیجر

معلومات

مستقبل کی جنگ اور عورت

تاریخ ماضی کا یہ نہایت نادر واقعہ ہے کہ عورت نے کبھی مصاف جنگ میں مرد کی طرح قتل و خونریزی سے کام لیا ہو۔ لیکن گزشتہ جنگ عظیم میں عورتوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اور اس کے بعد سے جو دنیائے عمل میں جو میلان ان کے اندر پایا جاتا ہے وہ عورت کے جس مستقبل کی پیشین گوئی کر رہا ہے بہت عجیب و غریب ہے۔

گزشتہ جنگ میں انھوں نے صرف اس حد تک خدمات انجام دی تھیں کہ زخمیوں کی تیمارداری یا اسی طرح کی کوئی اور خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی جو ان کی فطرت کے لحاظ سے موزوں ہو، لیکن اب جو آثار ظاہر ہو رہے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آیندہ جنگ میں عورت، مرد کے دوش بدوش توپ و تفنگ سر کرے گی، خندقوں کی تکلیف دہ زندگی میں مساویانہ طور پر شریک ہوگی، نیزہ و شمشیر سے حریف کا مقابلہ کرے گی، ہوائی جہازوں سے بم گرائے گی زہریلی گیس سے دشمن کو ہلاک کرے گی اور وہ سب کچھ کرے گی جسے اس وقت تک صرف مرد ہی کر سکتا تھا۔

چنانچہ روس، بولیویا، اور جاپان میں باقاعدہ فوجوں میں عورت کی بھرتی شروع ہو گئی ہے، ان کے لئے جنگی مدرسے قائم کئے جا رہے ہیں، وردیاں تیار ہو رہی ہیں اور ہلکے ہلکے ہتھیار ڈھالے جا رہے ہیں۔

انیمیا یا کمی خون کا بہترین علاج

یہ مرض اب بہت عام ہو گیا ہے اور مختلف طریقوں سے اس کا علاج کیا جاتا ہے، چنانچہ اس سے قبل ہم نگار کے صفحات میں اس کا ایک علاج یہ تحریر کر چکے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کچا گوشت، یا خام کلیجی استعمال میں رہے، لیکن اب ایک اور بہت زیادہ مفید طریق علاج یہ معلوم ہوا ہے کہ لوہے اور تانبہ کا ایک ایک باریک ورق یا پتر لے کر دودھ میں ڈال دیا جائے اور کامل ۱۲ گھنٹے کے بعد اس دودھ کو صاف کرکے پی لیا جائے۔ دودھ کے مزے میں اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اور نہایت ہی خفیف سا حصہ تانبہ اور لوہے کا دودھ میں مل جاتا ہے۔ اگر گرمی کی وجہ سے دودھ کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہو تو چاہئے کہ اسے برف میں لگا کر رکھیں۔

آواز اور حیات انسانی

متعدد تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ آواز، حیات کی دشمن ہے کیونکہ پریشان آوازیں خلایا اور خون کے سرخ ذرات کو تباہ کر دیتے ہیں۔

اس کا تجربہ یوں کیا گیا کہ زندہ جراثیم اور سرخ ذرات خون کے پہلے ایک مقفل ظرف میں رکھے گئے۔ اس کے بعد وہ حوض میں ڈالے گئے اور موجوں میں جنبش دے کر آواز پیدا کی گئی - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف جراثیم اور ذرات اسی طرح ہلاک ہو گئے اور باقی نصف بھی بہت مضمحل حالت میں تھے۔

اس کے علاوہ اور تجربات بھی کئے گئے جنھوں نے ثابت کیا کہ شور و غوغا حیات انسانی کے لئے بہت مضر ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو متمدن شہروں میں اس کا انتظام کیا جائے اور ایسے مقامات میں سکونت اختیار کی جائے جو شور و ہنگامہ سے بالکل علیحدہ ہوں۔

مصنوعی انسان گزشتہ سال اخباروں میں ہنگامہ پیدا ہوا تھا کہ اہل مغرب نے ایک مصنوعی انسان بنالیا ہے جو آدمی کی طرح بعض خدمات انجام دیتا ہے، لیکن چند دن کے بعد پھر خاموشی چھا گئی اور کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ مصنوعی انسان مر گیا یا ہنوز زندہ ہے۔

اب امریکہ کی نمائش گاہ سنٹ لوئی میں پھر ایک جدید مصنوعی انسان پیش کیا گیا ہے جو ٹیلی فون کے پیغامات سنتا ہے، ان کے مطابق عمل کرتا ہے، سیٹی بجاتا ہے، گاتا ہے، بجلی کے قمقمے روشن کرتا ہے اور انھیں گل کرتا ہے۔ ٹیلی فون دینے کے لئے صدر مقام کو مخاطب کر کے جہاں گفتگو کرنا ہوتی ہے وہاں کا نمبر بتاتا ہے اور اسی طرح کی بہت سی خدمتیں گھر کی انجام دیتا ہے اس کا نام روبوٹ ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ اس ایجاد کو اور زیادہ مکمل کیا جائے۔ سچ ہے جب عورت اہلی زندگی سے بیزار ہو جائے گی تو مرد اس کی تلافی اسی طرح کرے گا۔

سورج اور قوت کہربا جرمنی کے ایک نوجوان شخص ڈاکٹر برونو لانگ نے جن کی عمر صرف ۲۸ سال کی ہے، حال ہی میں ایک ایسا کہربائی آلہ ایجاد کیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے آفتاب کی شعاعوں کو قوت کہربائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اس سے زیادہ بدبختی ایک انسان کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ یوم آفرینش سے لے کر اس وقت آفتاب اپنی کہربائی قوت کی دولت تمام دنیا کے لئے وقف کئے ہوئے ہے اور کوئی اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اگر ڈاکٹر موصوف کی یہ ایجاد بروئے کار آ گئی تو اس میں شک نہیں کہ دنیا کے نظام اقتصاد و عمل میں بڑا انقلاب پیدا ہو جائے گا، اور وہ گرم ممالک جہاں آفتاب سال کے اکثر حصہ میں نظر آتا رہتا ہے اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے اگر ان کو اس کی توفیق ہو۔

دنیا کا سب سے بڑا غبارہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا غبارہ اکرون ہے جسے امریکہ نے بنایا ہے۔ اس کا رقبہ ۶۵۰۰۰۰۰ مکعب فٹ ہے اور لمبائی ۷۸۵ فٹ - اس کے اندر ہیلیوم گیس بھری ہوئی ہے جو مشتعل نہیں ہو سکتی اور ۹۰ ٹن بوجھ اس غبارہ سے اٹھایا جا سکتا ہے - اس کے موٹر سے ۴۴۸۰ گھوڑوں کی قوت پیدا ہوتی

ہے اور ۳۴۸ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ صرف ۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرے تو بھی ۵۸۰۱ میل تک بغیر ایک مرتبہ کے سامان پرواز اڑ سکتا ہے

عورتوں کا دشمن | جرمنی کا مشہور فیلسوف نیتشے، جنس لطیف کی دشمنی کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتا تھا چنانچہ اس کا ایک قول ہے کہ " مرد جنگ کے لئے پیدا ہوا ہے اور عورت تاوان جنگ کے لئے۔ مرد کو چاہئے کہ جب عورت کے پاس جائے تو اس کے ہاتھ میں کوڑا ہو "

لیکن ہرٹز میں ایک شخص حال ہی میں ایسا پیدا ہوا تھا جو نیتشے سے زیادہ عورتوں کا دشمن تھا۔ اس کا نام مسٹر لڈلیک تھا۔ اس نے مرتے وقت وصیت کی کہ اس کے ترکہ سے ۶ ملین ڈالر صرف کرکے ایک کتابخانہ قائم کیا جائے لیکن اس دروازہ پر یہ ہدایت جلی حروف میں کندہ کرادی جائے کہ " عورتیں اندر نہیں آسکتیں "

اس نے اپنی وصیت میں تاکید کی ہے کہ کتاب خانہ کے اندر نہ کسی عورت کی تصویر آویزاں کی جائے اور نہ کوئی نسائی تصنیف اس میں جگہ پائے۔ اس نے ایک بیٹی چھوڑی لیکن ترکہ میں اس کا حصہ صرف پانچ ڈالر رکھا۔

نقش برہوا | اس سے قبل جب کسی شخص کے فعل عبث یا ناپائدار و ناممکن بات کا ذکر کیا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ نقش برآب ہے یا نقش برہوا۔ لیکن اب علوم کی ترقی چونکہ ہر ناممکن کو ممکن بنائی جارہی ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ " نقش برہوا " بھی محال رہے۔

جرمنی کے ایک ماہر برق نے ایک ایسا قمقمہ بجلی کا بنایا ہے جو فضا میں نصف میل تک روشنی کو پھینکتا ہے اور آیندہ اس کے ذریعہ سے روشن حروف پیدا ہوتے ہیں اس قمقمہ سے ایک ارب، ۵ کروڑ بتیوں کی روشنی پیدا ہوتی ہے اور برلن میں رات کے وقت اشتہارات فضائی کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اہل امریکہ بھی اس کی تقلید کرنا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے۔

حصول شہرت کا عجیب ذریعہ | حال ہی میں امریکہ کا ایک صاحب ثروت مرا تو علاوہ اور تمام مال و اسباب کے جو اس نے اپنی اولاد کے لئے چھوڑا، ستر پتلون بھی تھے جن کے متعلق اس کی وصیت تھی کہ یہ چار چار شلنگ میں فروخت کئے جائیں۔ جب یہ پتلون فروخت ہوئے تو ایک خریدار نے اس کے جیب میں استر کے اندر سلا ہوا ایک نوٹ سو گنی کا پایا اور اسی کے ساتھ یہ تحریر کہ " میں نے اپنی ساری زندگی حصول شہرت میں صرف کی اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مرنے کے بعد بھی باقی رہے " جب یہ خبر شایع ہوئی تو پتلونوں کے خریداروں نے اپنے اپنے خریدے ہوئے پتلونوں کو ٹٹولا تو سب کو جیبوں کے اندر سے اتنی دولت ملی جس کا انھیں خیال بھی نہ ہوسکتا تھا۔

براہ کرم خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیے

مینیجر

بقیہ ملاحظات بسلسلۂ صفحہ

لی نہیں جاتی یہ جنگ ہے صبر و تحمل، ضبط و ایثار کی جس کا حربہ صرف محبت و رافت ہے، اور جہاں

شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

گول میز کانفرنس میں جو نمایندے مسلمانوں کی طرف سے منتخب کئے گئے ہیں ان میں تقریباً سب وہ ہیں جنھیں مسلمانوں کے مفاد سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی - ان میں ایک جو بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں وہ بہت زیادہ غیر مسلم ہیں، کیونکہ ان کے عقائد و شعائر، ان کے اصول و معتقدات جمہور مسلمین سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور نہ ہمارے اُن کے درمیان کسی قسم کے معاشرتی تعلقات قائم ہو سکتے ہیں - یہ اپنی زندگی کا بڑا حصہ یوروپ میں بسر کرتے ہیں اور ان کی بڑی خصوصیت صرف یہ ہے کہ وہ محل شاہی میں ملک معظم کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں، ان کے گھوڑے ہر سال دوڑ میں بازی لے جاتے ہیں، اور جب حکومت کو ضرورت ہوتی ہے تو اُن کے نام سے (جو بدقسمتی سے مسلمانوں کا سا ہے) فائدہ اٹھا کر پیروان اسلام کو مرعوب کرنے کے لئے انھیں آگے بڑھا دیتی ہے -

ان کے بعد دوسرا درجہ ہندوستان کے اس بڑے مقنن کا ہے جو اس وقت مسلمانوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ و ذی شعور سیاست داں سمجھا جاتا ہے، حالانکہ جہاں تک نفس اسلام کا تعلق ہے ان کی یہ حالت ہے کہ جب ایک غیر مسلم خاتون کے ساتھ اُن کی شادی کا وقت آتا ہے اور اُن سے کلمہ پڑھنے کو کہا جاتا ہے تو وہ گھبرا جاتے ہیں اور آخر کار سروجنی نائڈو "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ان کی زبان سے ادا کرا کے از سر نو مسلمان بنا دیتی ہیں -

ان کے بعد وہ بزرگ ہیں جنھیں میں ہمیشہ "طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ" کہتا ہوں - ان کے گزشتہ کارناموں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، ان کی تازہ تقریریں، و تحریریں کافی ثبوت اس امر کی ہیں کہ وہ اس وقت صرف انگریزوں کے ساتھ چائے پی لینا، ان کے جلسوں میں باریاب ہونا ہی اتنی بڑی نعمت سمجھتے ہیں کہ اگر وہ بجائے ڈاسن اور بوسنک کے خود ہی کھانے کے جوتے انکو پہنا دیں تو شاید انکے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے انھوں نے عزم کر لیا ہے کہ اب ہندوستان آگر وہ یونین جیک خود اپنے ہاتھ میں لیں گے اور مسلمانوں کو اس کے نیچے جمع کر کے بتائیں گے کہ غلامی کتنی بڑی نعمت ہے اور اس کے قائم رکھنے کے لئے انھیں کس کس طرح حکومت نصاریٰ کا ساتھ دینا چاہئے -

ایک اور صاحب جالہ آباد سے تعلق رکھتے ہیں ان کی ہمدردی بھی مسلمانوں کے ساتھ بہت بڑھی ہوئی ہے اور اسی احساس اسلامی کی بنا پر وہ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو اپنا روپیہ برطانوی مال اور برطانوی کپڑے کی خریداری میں لگا دینا چاہئے، کیونکہ نجات اب اسی میں ہے اور یہی وہ سیدھا راستہ ہے جو مکہ کو جاتا ہے - سو خیر بدقسمت مسلمان اس سے فائدہ اٹھائیں یا نہ اٹھائیں، لیکن اُن کو تو اس کا معاوضہ پبلک سروس کمیشن میں چار ہزار روپیہ ماہوار کی جگہ پا کر، مل ہی گیا ذٰلک مبلغھم من العلم (؟)

پنجاب کے جو مسلم حضرات نمایندگی کر رہے ہیں، اُن کے متعلق اظہار رائے کی ضرورت نہیں کہ اُن کا تمام سرمایۂ حیات وعمل ہی خوان حکومت کی زلہ ربائی کا ممنون ہے، اس لئے جب ہر مسلمان واقف ہے کہ گول میز کانفرنس میں اُس کی صحیح نمایندگی نہیں پائی جاتی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا اظہار نہ کر دیا جائے اور آیندہ کے لئے پھر ان لوگوں کو "دخل در معقولات" کا موقعہ دیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں میں قوم پرست جماعت کے افراد جو روز روشن میں اس ظلم وغارتگری کو دیکھ رہے ہیں، کوئی کروٹ نہیں لیتے اور وہ اس طرح خاموش ہیں گویا کہ اُن کی زبان حلق کے اندر سے کھینچ کر باہر پھینک دی گئی ہے

افقِ صحافت پر ایک نئے آفتاب کا طلوع

روزنامہ "ناخدا"

جو دسمبر ۱۹۳۱ء کے پہلے ہفتہ سے بہ ادارت

مولانا نیاز فتحپوری

محض قوم و وطن کے حصول آزادی میں حصہ لینے کے لئے جاری ہو رہا ہے

اور جو

اپنی انشاء بلند، مقالات علمیہ، تحقیقات تاریخی، تنقیدات عالیہ، معلومات عامہ، منظومات نادرہ اور فکاہات لذیذ کے لحاظ سے گویا یوں سمجھ لیجئے کہ

رسالۂ نگار کا روزانہ اڈیشن ہو گا

بہت بڑے سائز کے نفیس کاغذ پر معہ تازہ ترین برقی خبروں کے جو براہ راست حاصل کیجائینگی آپ کی خدمت میں روز حاضر ہوتا رہے گا۔ صرف پہلا پرچہ بطور نمونہ مفت مل سکے گا لیکن انھیں حضرات کو جو طلب فرمائیں گے۔

پہلا پرچہ ۱۰ ہزار شائع ہو گا اس لئے اشتہار دینے والوں کو خاص موقعہ حاصل ہے۔

سالانہ چندہ	ششماہی	سہ ماہی	ایک ماہ
مدعہ ۵ر	معہ ر	للعہ ر	۱۲ر

منیجر روزنامہ ناخدا لکھنؤ

رسالہ نگار میں اس وقت تک اسلامی علوم و تعلیم شعائر مذہبی و اعمال اللہ تعالے جل شانہٗ و حضرات انبیاء کرام علیہم السلام و اصحاب اہل بیت رسالتمآب صلعم و دیگر بزرگان دین و آئمہ دین و علمائے سلف کے متعلق جو مضامین میرے یا دیگر مقالہ نگاروں کی طرف سے شائع ہوئے ہیں ان کو میں اپنے خیال سے اسلام کی خدمت سمجھتا تھا۔ لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے یہ خیالات احترام اسلام و شریعت کے خلاف تھے جن پر میں منفعل ہوں اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ اب میں ان تمام امور سے باز آتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میری طرف سے ایسے مقالات نہ شائع ہوں گے جنسے مذہبی شکایت کا سبب پیدا ہو مجھے افسوس و ندامت ہے کہ ان مضامین سے مسلمانوں کو صدمہ پہونچا اور یہ یقین دلانے کے لئے کہ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں اپنے معاصی سے جناب باری میں اظہار برأت و استغفار کرتے ہوئے اعلان کرتا ہوں کہ

لا الٰہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین استغفر اللہ الذی
لا الٰہ الا ھو الحی القیوم من کل ذنب و اتوب الیہ و صلی اللہ
تعالے علی خیر خلقہ سیدنا محمد و آل و اصحابہ اجمعین و علی
جمیع الانبیاء والمرسلین و من تبعھم باحسان الی یوم الدین
والحمد للہ رب العالمین

---

۱۳ اکتوبر کے ہمت کے اعلان اور اکتوبر کے "نگار" میں جو کچھ ملاحظات کے تحت میں چھپا ہے اس کو اعلان معذرت سے قبل لکھنے کے باوجود کالعدم قرار دیتا ہوں کیونکہ اگرچہ وہ معذرت نامہ پر دستخط کرنے سے لکھے گئے تھے، مگر ان کی اشاعت بعد کو بھی ہوئی اور اس معذرت نامہ کی روح کی منافی تھی —— نگار میں آئندہ کسی قسم کے مذہبی مضامین درج نہ کروں گا واللہ علی ما نقول شہید

نیاز

مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول عہ
〃 دوم عہ
〃 سوم عہ
الفاروق ع و ے
سیرۃ النعمان ۱۲ر
الغزالی ۱۲ر
المامون ۱۲ر
سوانح مولانا روم ۱۲ر
سفرنامہ مصر و شام ۱۲ر و ۸ر
علم الکلام ۱۲ر و ۸ر
الکلام ۱۲ر و ۸ر
رسائل شبلی ۱۲ر
مقالات شبلی عہ
شعر العجم جلد اول ۱۲ر
〃 دوم ۸ر
〃 سوم ۸ر
〃 چہارم ۸ر
〃 پنجم ۱۲ر
موازنہ انیس و دبیر عہ
مضامین عالمگیر عہ
آغاز اسلام ۱۲ر
کلیات فارسی شبلی ۸ر
کلام شبلی اردو ۱۲ر

رتن ناتھ سرشار

سیر کہسار ۱۲ر
خدائی فوجدار ۸ر
جام سرشار ۸ر
الف لیلہ بطرز ناول عہ
کامنی عہ

منشی سجاد حسین مرحوم

سوانح عمری عمر و عیار عہ
احمق الذی ۸ر
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۶ر
طرحدار لونڈی عہ
طلسمی فانوس ۱۲ر

جوالا پرشاد برق

مرنالنی ۱۰ر
مار آستین ۱۰ر
بنگالی دولہن ۱۲ر
معشوقۂ فرنگ ۸ر
پرتاب ۱۲ر
روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ
ملکہ زنوبیہ ۳ر
قرۃ العین ۳ر
محذرات ۸ر
جویائے حق للعہ
لعبت چین عہ
فاتح و مفتوح ۸ر
بابک خرمی عہ
الفانسو ۱۲ر
ایام عرب ۸ر
قیس و لبنیٰ ۸ر
یوسف و نجمہ عہ
زوال بغداد ۸ر

مینا بازار عہ
مقدس نازنین عہ
رومۃ الکبریٰ ۸ر
فلپانا ۸ر
شوقین ملکہ ۸ر
منصور موہنا ۸ر
حسن انجیلنا ۸ر
ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
فردوس بریں ۸ر
حسن کا ڈاکو ۸ر
دربار حرام پور ۱۰ر
غیب داں دولہن عہ
بدر النساء کی مصیبت ۸ر
میوۂ تلخ ۸ر
نیکی کا پھل عہ

شوق قدوائی

ترانۂ شوق عہ
قاسم و زہرہ ۱۲ر
نیرنگ جمال ۸ر

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری ۸ر
بہرام کی گرفتاری عہ

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

شعلۂ رنگین ۸ر
محاصرۂ پیرس عہ
شیخ چلی ۸ر
بہرام کی واپسی ۸ر
انقلاب فرانس عہ
حسن بنارس ۸ر

فطرتی جاسوس عہ
ترکی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۸ر
بہرام چور عہ
زر پرست عہ
کنجی کا راز عہ
عبدالرحمن ناصر ۸ر
عروس مصر ۸ر
سیلاب خون عہ
سیاحت زمین عہ
سیاحت ہوا عہ
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر ۸ر
اسرار بالشویزم عہ
ذرج لیلیٰ ۸ر
آہنی بک عہ
حجاج بن یوسف عہ
یوسف پاشا عہ
انقلاب عثمانی عہ
بہرام کی رہائی عہ
بہرام کی آزادی ۱۲ر
بہرام کی سرگزشت عہ
لال گھوڑا عہ
پراسرار قتیل ۸ر

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب عہ
بزم خیال عہ
نشاط سخن عہ
انشار نسواں ۶ر
مکاتیب محسن الملک عہ

لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸ر

مراثی

مراثی دبیر ۸ر
مراثی انیس للعہ
مراثی ضمیر عہ
مراثی مونس ۱۲ر
مراثی دلگیر ۱۲ر

تذکرۃ الشعراء

تذکرہ حسینی ۱۱ر

گلشن

۱۰ر
سراپائے سخن عہ
سوانح نظیر اکبرآبادی ۸ر

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز ۱۲ر
کلیات عراقی ۱۲ر
دیوان حافظ عہ
دیوان بیدل عہ
دیوان عرفی ۱۲ر
کلیات جامی عہ
کلیات غالب عہ
کلیات صائب ۱۲ر
دیوان ناصر علی ۶ر
کلیات سعدی عہ
کلیات حزیں ۱۲ر
دیوان عنصری ۱۴ر
دیوان غنی کشمیری ۶ر
دیوان ہلالی ۶ر

دواوین اردو

کلیات ظفر ۱۲ر
کلیات مومن عہ

دیوان ناسخ عہ
کلیات میر عہ
کلیات سودا عہ
کلیات انشا عہ
کلیات نظیر اکبرآبادی عہ
گلزار داغ ۸ر
دیوان رند ۹ر
دیوان ذوق ۱۲ر
کلیات اسمٰعیل ۸ر
مرآۃ الغیب عہ
صحیفۂ عشق ۸ر
فریاد داغ ۸ر
دیوان قائل ۸ر
دیوان شہیدی ۸ر

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات } عہ
تصویر رنگین
〃 با تصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون ۸ر
طلسم فرنگ ۸ر
کارخانۂ عالم عہ

رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین دہلی ۱۲ر
فریب حسن ۸ر
سوزن عشق عہ
روزا لیمبرٹ للعہ
نادان اسرار ۸ر
شام جوانی ۸ر
طلسمی فانوس ۱۲ر

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

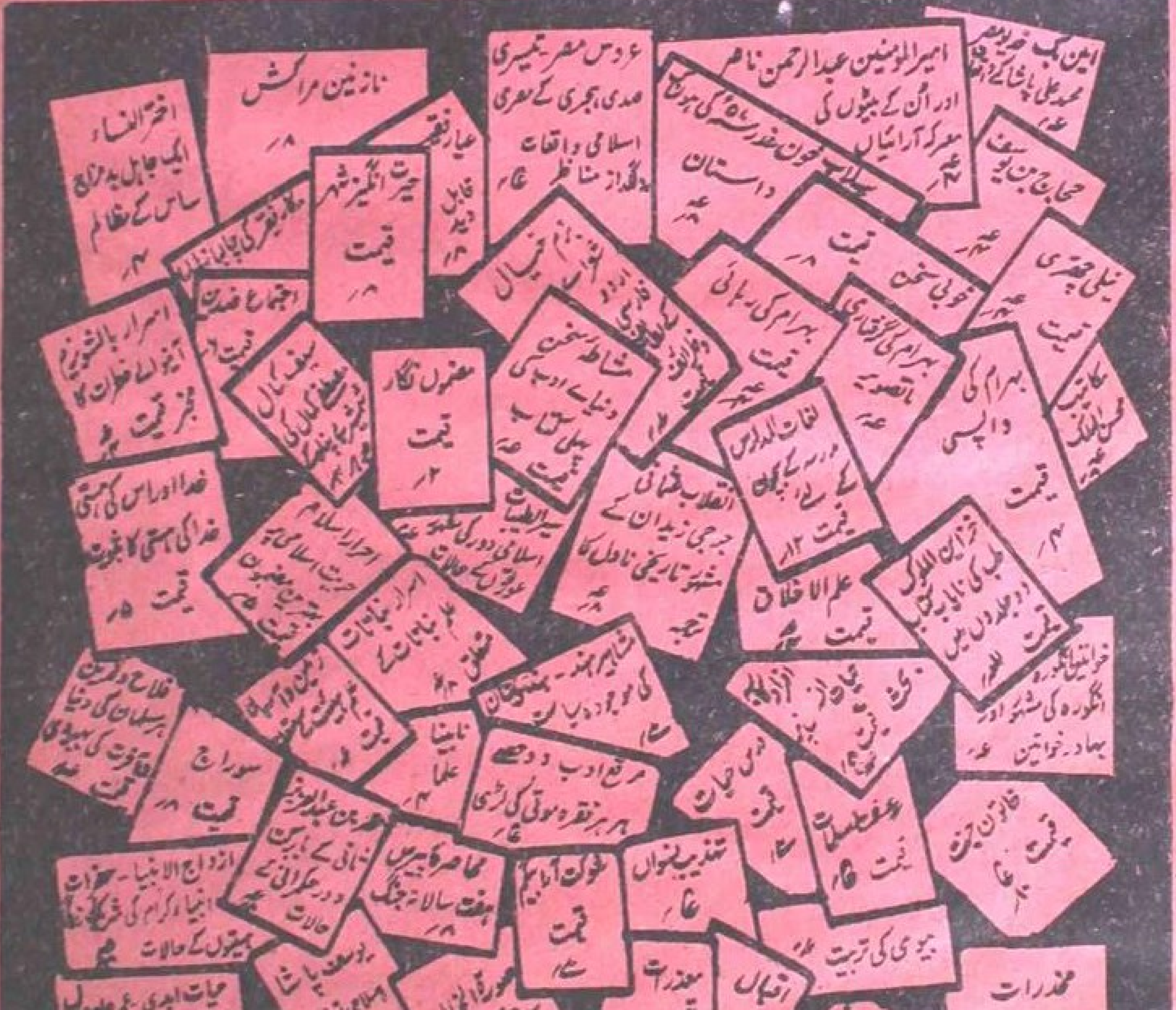

منیجر رسالہ نگار لکھنؤ

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس نیا گاؤں لکھنؤ باہتمام سید توسل حسین